S. No. 7

ISSN : 2394-5567

سہ ماہی ادبی جریدہ

دبیر

جلد:سوم

شمارہ: دوم

اپریل تا جون ۲۰۱۶ء

مدیر

احمد نوید یاسر 'ازلان حیدر'

از: دبیر حسن میموریل لائبریری، کاکوری، لکھنؤ

DABEER

April to June-2016

S. No. 7

ISSN : 2394-5567

S. No. 7

DABEER

(An International Peer Reviewed Refereed Quarterly Literary Research Journal)

Volume : 3

Issue No. : 2

April To June-2016

Editor

Ahmad Naved Yasir 'Azlan Hyder'

Address

DABEER HASAN MEMORIAL LIBERARY

12, Choudhri Mohalla, Kakori, Lucknow-226101

Mob. No. 09410478973, email: dabeerpersian@rediffmail.com

ISSN:- 2394-5567

صوفیاء کی زمین کاکوری سے فارسی ادب کا ترجمان.....

سہ ماہی ادبی جریدہ۔

دبیر

جلد۔۳ شمارہ۔۲

اپریل تا جون ۲۰۱۶ء

☆ایڈیٹر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔ چودھری محلّہ (جنوبی)، کاکوری، لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ مقالہ نگاروں سے گزارش:۔ حواشی مقالہ کے آخر میں لکھیں، مآخذ کے حوالہ جات اس ترتیب میں ہوں:۔ مصنف یا مولف، کتاب کا نام جلد، مقام اشاعت، سن اشاعت، صفحہ نمبر۔

اپنے مقالے اردو ان پیج، یا ایم ایس ورڈ کی فائل میں ہمارے برقی پتے پر ارسال کریں۔

☆سرپرست☆ **پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی**، صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

☆نگران اعلی☆، **ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی**، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

☆نگراں☆، **ڈاکٹر انجمن صدیقی** (لکھنؤ)

☆مجلس ادارت☆

پروفیسر سید حسن عباس، شعبۂ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، شعبۂ فارسی، اے ایم یو علی گڑھ

پروفیسر علیم اشرف خان، شعبۂ فارسی، ڈی یو، دہلی

ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی، شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل، شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

محمد قمر عالم، شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

ذوالنورین حیدر علوی، مدیر شش ماہی ''تصفیہ'' کاکوری، لکھنؤ

سید نقی عباس کیفی، مدیر سہ ماہی ''نقد و تحقیق'' دہلی

ارمان احمد، مدیر سہ ماہی ''عرفان'' چھپرا، بہار

☆معاون مدیران☆

محمد توصیف خان کاکر۔ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

عاطفہ جمال، فارسی، لکھنؤ

مناظر حق بدایونی، فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

محمد حسن، تعلیم، اے ایم یو، علی گڑھ

محمد انس، تاریخ، اے ایم یو، علی گڑھ

سارم عباس، فلسفہ، اے ایم یو، علی گڑھ

اشرف علی، ہندی، اے ایم یو، علی گڑھ

راجیش سرکار، سنسکرت، بی ایچ یو، وارانسی

محمد جعفر، فارسی، جے این یو، دہلی

سعد الدین، فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

☆ریویو کمیٹی☆

پروفیسر آذرمی دخت صفوی،
ڈائرکٹر، مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ

پروفیسر شریف حسین قاسمی،
سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس دہلی یونیورسٹی، دہلی

پروفیسر محمد اقبال شاہد، ڈین فیکلٹی آف لینگویجز اسلامک واورینٹل لرننگ، جی سی یو، لاہور، پاکستان

پروفیسر ابوموسیٰ محمد عارف باللہ،
ڈائریکٹر البیرونی فاؤنڈیشن، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

پروفیسر عبدالقادر جعفری، صدر شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی

ڈاکٹر نجم الرشید، شعبۂ فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

☆مجلس مشاورت☆

پروفیسر مسعود انور علوی، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پروفیسر عراق رضا زیدی، صدر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی، شعبۂ فارسی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

پروفیسر محمد مظہر آصف، شعبۂ فارسی، گوہاٹی یونیورسٹی، آسام

پروفیسر عزیز بانو، صدر شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد

پروفیسر وجیہ الدین، شعبہ عربی و فارسی، بڑودا یونیورسٹی، بڑودا، گجرات

احمد علی، کیپر (مینسکرٹ)، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، تلنگانہ

ڈاکٹر عطا خورشید، مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو، علیگڑھ

ڈاکٹر مظہر عالم صدیقی، یوسف اسلام کالج، جوگیشوری، ممبئی

ڈاکٹر محمد شعائر اللہ خاں وجیہی قادری رامپوری، مسٹن گنج، رامپور

ڈاکٹر عابد حسین، صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

ڈاکٹر اخلاق احمد، شعبۂ فارسی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی

ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان، مانو، حیدرآباد

ڈاکٹر رضوان اللہ آروی، شعبۂ فارسی، ایچ ڈی جین کالج، آرہ، بھوج پور

سید عادل احمد، محکمہ آثار قدیمہ، حیدرآباد، تلنگانہ

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
۱۔	اداریہ	ازلان حیدر	۴
☆	**مقالات**		
۲۔	مجالس جہانگیری	عارف نوشاہی / معین نظامی ترجمہ: وجیہ فرقان	۵
۳۔	تاریخ ہند کا اہم مآخذ۔ ملخص شاہجہاں نامہ	محمد عابد حسین	۴۹
۴۔	عہد اورنگ زیب کی ایک علمی شخصیت۔ شاہ عبدالرحیم دہلوی	طاہرہ وحید عباسی	۵۴
☆	**میراث خطی**		
۵۔	حضرت تپاںؔ کا فارسی قصیدہ ''مطلع الانوار''	رضوان اللہ آروی	۵۸
☆	**دکنیات**		
۶۔	دارالضرب: گولکنڈہ	سید عادل احمد	۷۲
☆	**آئینۂ تحقیق**		
۷۔	پایان نامہائے شعبہ فارسی، کشمیر یونیورسٹی، کشمیر	لطیف احمد سلمانی	۷۶
☆	**چشم بینش**		
۱۵۔	حیات سعدی (تحشیہ و تعلیقات: سید محمد اسد علی خورشید: ایک تعارف	ازلان حیدر	۷۸

English Aritcles:

1. Assessment of Hindi & Sanskrit Literature
Zafar Iftekhar 3

2. Musical Instruments as depicted in the miniature paintings from the State Museum: A study B. Ganga Devi 9

اداریہ

عہد حاضر میں جسے کچھ معنوں میں انتشار وتفریق کا دور بھی کہا جا سکتا ہے، اہل علم طبقہ کو بڑے ہی صبر و تحمل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، سیاسی مفاد نے رہنماؤں کو صرف ذاتی حد تک ہی سوچنے کی محلت دی ہے، لیکن آفتاب علم کی شعاؤں کو روکنا کسی سیاسی جماعت یا حالات کے بس کی بات نہیں، اس کا ثبوت ہمارا درخشاں ماضی ہے کہ جب منگولوں نے انسانیت کو تار تار کر دیا، علماء فضلاء وادباء کو زیوردار بنا دیا تب بھی یہ سورج اپنی پوری تابناکی کے ساتھ چمکتا رہا تو یہ تو جمہوریت کا دور ہے۔ بہر حال علم کے لئے جہاں ایک طرف یہ ضروری ہے کہ کتب اور اساتذہ سے استفادہ حاصل کیا جائے وہیں علم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مباحث ہوتے رہیں اور جدید تحقیقات بھی سامنے آتی رہیں، اور اس کا سلسلہ اس طرح شروع سے ہی آگے بڑھ رہا ہے کہ ہر سال مختلف دانشگاہوں، اداروں اور تنظیموں کے ذریعہ ادبی سیمینارس کا انعقاد کیا جاتا ہے تاکہ ہم جدید تحقیقات سے آشنا ہو سکیں۔

اس ضمن میں گذشتہ سال کے اواخر سے لے کر موجودہ سال کے اوائل تک ہندوستان میں کئی اہم موضوعات پر کامیاب سیمینار منعقد ہوئے جن میں آل انڈیا پرشین ٹیچرس ایسوسیشن کا سیمینار، پٹنہ یونیورسٹی۔ انسٹیٹیوٹ آف پرشین ریسرچ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سیمینار۔ ممبئی یونیورسٹی کا سیمینار۔ شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سیمینار اور شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی کا سیمینار کامیاب اور معلوماتی رہے۔ شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ''نکہت عرفان وشعر ہای فارسی شبہ قارہ ہند'' جیسے صوفیانہ وشاعرانہ موضوع پر سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار اپنے عنوان کی مناسبت سے یگانہ رہا۔ پچھلے دنوں مشہور ومحقق اور مشفق استاد جناب پروفیسر عارف نوشاہی صاحب کی ہندوستان آمد پر علی گڑھ میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اور ان کے دو پر مغز لکچر بھی سننے کا حسن اتفاق ہوا۔ ان کی جدید تحقیق اور تدوین ''مجالس جہانگیری'' کے بارے میں ان سے سن کر یہ اشتیاق ہوا کہ اس تصنیف کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر کے شائع کی جائیں لہٰذا استاد محترم سے اس پر تبادلہ خیال کیا اور ان کی ہمدردی اور ادب نوازی کہ انہوں نے مجالس جہانگیری کے مقدمہ کا اردو ترجمہ ہمارے جریدے کے لئے ارسال کیا جو کہ شامل شمارہ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ تحقیق تاریخ وادبیات فارسی کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوگی خاص کر عہد جہانگیری کی تاریخ کے مطالعہ کے لئے تو مشعل راہ بنے گی۔ علاوہ ازیں پروفیسر محمد عابد حسین، پروفیسر طاہرہ وحید عباسی کے مضامین کے ساتھ ہی استاد مشفق جناب ڈاکٹر رضوان اللہ آروی کا مضمون حضرت تپاں پھلواروی کے قصیدے مطلع الانوار پر بھی اس شمارے کی زینت ہے اور غالباً اس قصیدے کا مکمل متن پہلی بار ہمارے جریدے میں ہی شائع ہو رہا ہے۔ ہم اپنے اساتذہ کی ان علمی وادبی نوازشات کے لئے ان کے تہہ دل سے ممنون ومشکور ہیں۔

﴿از لان حیدر﴾

تحریر و تحقیق: عارف نوشاہی (پروفیسر)، معین نظامی (پروفیسر)
فارسی سے اردو ترجمہ: وجیہہ فرقان
پاکستان

مجالس جہانگیری
جہانگیر کے دربار کے ادبی اور تہذیبی واقعات کا ایک منفرد مآخذ

خلاصہ

مجالس جہانگیری، نورالدین محمد ملقّب بہ جہانگیر (پیدائش: ۹۷۷ھ / ۱۵۶۹ء؛ تخت نشینی: ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء؛ وفات: ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) کی دل چسپیوں، رجحانات، طرزِ حکومت اور اس کے ابتدائی تین سالہ دورِ حکومت-۱۰۱۷-۱۰۲۰ھ/۱۶۰۸-۱۶۱۱ء -کے بعض واقعات کے لیے ایک مفید اور دل چسپ مأخذ ہے۔ اس کے مؤلف عبدالستّار بن قاسم لاہوری، جہانگیر کے درباری تھے اور یہ تمام واقعات ان کے چشم دید ہیں۔ **مجالس جہانگیری** کا اب تک ایک ہی مخطوطہ دریافت ہوا ہے جس کی بنیاد پر یہ کتاب ڈاکٹر عارف نوشاہی اور ڈاکٹر معین نظامی نے مرتّب کی اور ان کے مفصّل مقدمہ، تعلیقات اور اشاریوں کے ساتھ، مرکز پژوہشی میراث مکتوب، تہران، سے ۲۰۰۶ء میں شایع ہوئی۔ یہاں اس کتاب پر مرتّبین کے فارسی مقدمہ کا اُردو ترجمہ شایع کیا جا رہا ہے۔ یہ ترجمہ ۲۰۰۷ء میں شعبۂ فارسی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کی طالبہ وجیہہ فرقان نے ایم اے کے مقالہ کے طور پر ڈاکٹر معین نظامی کی نگرانی میں کیا۔ اشاعت سے قبل ڈاکٹر عارف نوشاہی نے اُردو ترجمے پر نظرِ ثانی کی ہے اور اسے اصل کے ساتھ ملایا ہے اور اس میں جزوی ترمیم اور حذف و اضافہ کیا ہے۔ اصل مقالہ میں **مجالس جہانگیری** کے مخطوطہ کے اوراق کے حوالے دیے گئے تھے، اردو ترجمہ میں اس کی تہران اشاعت کے صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے۔

اس مقالے میں تین موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے:

۱۔ **مجالس جہانگیری** کے مؤلف کے حالات؛ ان کے علمی و ادبی رجحانات، جہانگیر اور دربار کے دوسرے امراء و شعراء کے ساتھ ان کی قرابت اور تعلقات؛

۲۔ **مجالس جہانگیری** کا تجزیاتی مطالعہ؛

۳۔ **مجالس جہانگیری** کی روشنی میں جہانگیر کی تصویر اور شخصیت۔

۱۔ مجالس جہانگیری کے مولف:

مشرقی مؤلفین اور مصنّفین کے معمول اور طریقۂ کار کے برخلاف، کہ وہ اپنا نام کتاب کے دیباچے یا بعض اوقات کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں، **مجالس جہانگیری** کے مؤلف نے کتاب کے دیباچے میں یا اختتام پر کہیں بھی اپنا نام نہیں لکھا ہے۔ وہ کتاب کے دیباچے اور پوری کتاب میں خود کو ''کمترین مریدان'' اور ''کہترین مجلسیان'' کے نام سے یاد کرتے ہیں (ص۲)۔ کتاب کا قاری کسی بھی ذہنی سابقے کے بغیر پہلی بار دسویں مجلس میں عبدالستار کا نام دیکھتا ہے جہاں یہ بیان کیا گیا ہے:

''ہنوز سعادت کورنش نیافتہ بودم کہ خان جہان خطاب بہ این کمترین مریدان کردہ گفت کہ شیخ عبداللہ سرمست از برہان پور بہ حکم آمدہ است، بہ سمع اقدس رسانیدہ اند کہ آن درویش از مہابت پادشاہی ہراس خوردہ است۔ بنا بر این حکم عالی صادر شدہ کہ ہنوز کہ بہ شہر در نیامدہ، **عبدالستار** رفتہ آن درویش را دلاسا دادہ، کورنش دہد۔'' (ص۱۹)

ترجمہ: میں ابھی کورنش بجا نہیں لایا تھا کہ خانِ جہان نے مجھے کہا کہ شیخ عبداللہ سرمست کو حکم دے کر برہان پور سے بلایا گیا ہے۔ بادشاہ سلامت کو پتا چلا ہے کہ وہ درویش شاہی رعب وجلال سے خوفزدہ ہے۔ اسی بنا پر حکم عالی صادر ہوا ہے چونکہ وہ ابھی تک شہر میں داخل نہیں ہوا، عبدالستار جائے اور اس درویش کو دلاسا دے کر، کورنش دلائے۔

یہاں قطعاً معلوم نہیں ہے کہ عبدالستار کون ہے؟ شاید یہ کوئی تیسرا شخص ہے۔ لیکن چند سطروں کے بعد ''آنچہ حکم بود، بہ جا آوردم'' (جو حکم تھا، میں اسے بجالایا) کی عبارت ثابت کرتی ہے کہ کہنے والے، کتاب کے مؤلف ہیں۔

گیارہویں مجلس میں ان کا نام واحد متکلم کی صورت میں زیادہ واضح ہو کر سامنے آیا ہے: ''فرمودند کہ **عبدالستار!** این شعر از کیست؟... بندہ عرضہ داشت کرد کہ...'' (ص۲۳) [جہانگیر نے] فرمایا کہ عبدالستار! یہ شعر کس کا ہے؟... بندہ نے عرض کیا کہ...

اُنتالیسویں مجلس میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: ''مرا کہ عبدالستارم، حیرت در گرفت'' (ص۹۶)
میں جو عبدالستار ہوں، مجھے حیرت ہوئی۔

دیگر مجالس میں بھی جہانگیر کئی بار انھیں عبدالستار کے نام سے مخاطب کرتا ہے اور کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ کتاب کا مؤلف عبدالستار نامی شخص ہے۔ مثلاً ''برزبانِ مبارک رفت کہ عبدالستار پیش آید! سر برزمین نہادہ پیش آمدم'' (ص۷۰)[1] زبان مبارک سے نکلا کہ عبدالستار سامنے آئے! میں ادب سے سامنے آیا۔

عبدالستار کون ہیں؟

مجالس جہانگیری کے مطالب سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب کے مؤلف عیسائیت کا مطالعہ رکھتے ہیں۔ بعض مناظرے ومباحثے جو جہانگیر کے دربار میں فرنگی پادریوں اور علماے اسلام کے مابین ہوئے، مؤلف بھی ان میں حاضر تھے۔ جب کبھی جہانگیر نے ان سے زیر بحث مسائل کے بارے میں رائے چاہی انھوں نے ایک ماہر کی مانند اپنی آراء پیش کیں اور اپنے حریفوں کو خاموش کر دیا۔ فرنگی پادریوں اور علماے اسلام کے درمیان طویل ترین مناظرے کی

روداد چودھویں مجلس/۲۷صفر ۱۰۱۹ھ (۱۱مئی ۱۶۱۰ء) میں بیان کی گئی ہے (ص ۲۹-۳۷)۔ علماے اسلام کے دلائل اور اُن کی گفتگو کا جارحانہ انداز جہانگیر کو پسند نہ آیا اور دربار کے ایک امیر خانِ اعظم نے کہا ''عبدالستار در این مقدّمات خوب حاضر است'' (ص ۳۰) عبدالستار ان موضوعات میں بہت اچھی معلومات رکھتے ہیں۔ جہانگیر نے ان کی طرف اشارہ کیا اور وہ دلائل بیان کرنے لگے۔ جہانگیر ان کے دلائل سے اس قدر متاثر ہوا کہ خانِ اعظم سے مخاطب ہو کر کہا:

''پیش از این پنج شش روز عبدالستار در محفل مقدّس احوال حضرت عیسیٰ، کہ از انجیل و دیگر کتب نصاریٰ در این دولت بہ اتفاقِ پادریان بہ فارسی ترجمہ کردہ است، می خواند و چون بہ شوق تمام می خواند، بہ خاطر ملکوت ناظر ما گذشت کہ ہمانا عبدالستار عیسوی شدہ باشد!'' (ص ۳۴)

ترجمہ: اس سے پانچ چھ دن پہلے عبدالستار مقدس محفل میں حضرت عیسیٰ کے وہ حالات پڑھ رہے تھے جو انھوں نے درباری پادریوں کے تعاون سے، انجیل اور نصاریٰ کی دیگر کتب سے فارسی زبان میں ترجمہ کیے تھے اور چونکہ پورے شوق کے ساتھ پڑھ رہے تھے، مابدولت کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ شاید عبدالستار عیسائی ہو گئے ہیں۔

پادری بھی عبدالستار کے انجیل اور کتبِ نصاریٰ کے دقیق مطالعے پر متعجب ہوتے تھے۔ ایک پادری نے تو جہانگیر سے یہ تک کہہ دیا تھا: ''دعا ہا می کنیم کہ خدا عبدالستار را بہ ما دہد و دینِ ما نصیب او شود، امیدواریم کہ بہ حکم عالی نصرانی گردد'' (ص ۷۱) ہم دعائیں کرتے ہیں کہ خدا عبدالستار کو ہمیں عطا کر دے اور ہمارا دین اسے نصیب ہو، ہمیں امید ہے کہ وہ آپ کے حکم سے نصرانی ہو جائے گا۔

اگر ہم جہانگیر اور پادری کی باتوں کو مزاح سمجھیں، تو بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عبدالستار عیسائیت شناس تھے، وہ عیسوی عقائد کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگاہی رکھنے کی غرض سے پادریوں کے دوست بن گئے تھے (ص ۳۵)۔ ایک پرتگالی پادری زیرونموشویر Father Jerome Xavier (۱۵۴۹-۱۶۱۷ء) ان کا دوست تھا۔

ان شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا سکتا ہے کہ عبدالستار، **مجالس جہانگیری** کے مؤلف ہیں اور قاسم لاہوری کے فرزند، کیونکہ انھوں نے اپنی دیگر تصانیف **ثمرۃ الفلاسفہ** اور **خلاصۂ ظفر نامہ** میں اپنے والد کا یہی نام لکھا ہے۔ **مرآت القدس**، نسخہ برٹش لائبریری، لندن کے آخر میں پادری زیرونموشویر کی ایک یادداشت میں ان کا مکمّل نام مولانا عبدالستار بن قاسم لاہوری آیا ہے۔ یادداشت یہ ہے:

''این نامۂ گرامی و دیباچۂ سعادت بندہ پادری زیرونموشویر فرنگی از طائفہ صحبت [!] حضرت عیسیٰ بہ حکم شاہنشاہ دوران، خدیو روشن جان، برای روزگار [!] جلال الدّین اکبر پادشاہ، -خلد اللّہ ملکہ و سلطانہ- از انجیل مقدّس و دیگر کتبِ پیغمبران در دار الخلافت آگرہ فراہم آوردہ، مولانا عبدالستّار بن قاسم لاہوری بہ اتفاق این بندہ در ہمان دار الخلافت آگرہ ترجمہ کرد در سنۂ ہزار و شش صد و دو (۱۶۰۲) از ولادت حضرت ایشوع مسیح و چہل و ہفت الٰہی انجام یافت۔ تحریراً فی التاریخ ہشتم ماہ رمضان المبارک، در روز چہار شنبہ، سنۂ ہزار و بیست و ہفت۔'' (۲)

لنڈے زیانا (Linddesiana) میں ثمرۃ الفلاسفہ کے ایک خطّی نسخے کی یادداشت میں درج ہے کہ عبدالستّار کے والد، قاسم لاہوری وہی محمد قاسم ''فرشتہ'' ہیں جو تاریخ فرشتہ کے مؤلف ہیں۔ (۳) لیکن اس بات کو قبول کرنے میں احتیاط کرنی چاہیے۔ فرشتہ نے گلشنِ ابراہیمی میں، جو تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے، تغلق خاندان کے بادشاہوں کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلطان ابراہیم ثانی عادل شاہ (۹۸۷ - ۱۰۳۵ھ) نے اسے اوائل حکومت میں جہانگیر کے دربار میں بطور ایلچی بھیجا تھا۔ (۳) یعنی وہ اس کا باقاعدہ درباری نہیں تھا جب کہ مجالس جہانگیری کا مؤلف باضابطہ درباری ہے۔

اس نکتے کی طرف اشارہ کرنا بھی مفید ہے کہ عبدالستّار نے **مجالسِ جہانگیری** میں لاہور کو ''شہر لاہور کہ جاودان محفوظ باد'' (ص۶۴) - لاہور شہر ہمیشہ محفوظ رہے - کے دعائیہ کلمات کے ساتھ یاد کیا ہے۔ یہ ان کی حبّ وطن اور لاہوری ہونے کی دلیل ہوسکتی ہے۔ اگرچہ انھوں نے آگرہ کو بھی ''ہزاران سال ہم چنین دارالملکِ این دولتِ خداداد باد'' (ص۳) - ہزاروں سال اسی طرح اس خداداد حکومت کا دارالسلطنت رہے - اور ''حرسہا اللّٰہ'' (ص۱۷) - خدا اس کی حفاظت کرے - کے دعائیہ جملوں سے یاد کیا ہے لیکن اس کا سبب آگرہ کا جہانگیری پایۂ تخت ہونا ہے۔

عبدالستّار کے رجحانات اور صلاحیتوں اور معاصرین کے ساتھ ان کے تعلقات کے بارے میں جو معلومات **مجالسِ جہانگیری** کے بین السّطور سے حاصل ہوتی ہیں ان کا اس طرح خلاصہ کیا جاسکتا ہے:

- وہ تاریخ، تاریخِ مذاہب، تاریخِ عیسائیت، علمِ کلام، عقاید عیسائیت اور مناظرہ سے دلچسپی رکھتے تھے اور **مجالس جہانگیری** کے متعدد واقعات اور اشارات اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ خاص طور پر مؤلف کے عیسائیت کے مطالعات ماہرانہ ہیں (ص۲،۳)۔

- ان کی ادبی اور شعری صلاحیت پختہ تھی۔ وہ علم معانی، بیان اور علم بدیع جانتے تھے اور ادبی و شعری اصطلاحات سے آگاہ تھے۔ مطالعہ کا ذوق رکھتے تھے اور تاریخی، ادبی اور فارسی اور فرنگی زبانوں کی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں۔ فرنگی/پرتگالی زبان بھی جانتے تھے۔

- ایک مرتبہ جہانگیر نے اپنی غزل کی تکمیل کے لیے حاضرین سے چاہا کہ اسے قافیے یاد دلائیں۔ مؤلف نے ایک قافیہ خدمت میں عرض کیا۔ جہانگیر نے ایک شعر پڑھا، مؤلف نے اسے ''سہل ممتنع'' کہا (ص۹)۔

- جہانگیر نے مؤلف سے پوچھا: یہ شعر کس کا ہے؟

دوست آن باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشان حالی و درماندگی

مؤلف نے جواب دیا: شیخ سعدی شیرازی کی **گلستان** سے ہے۔ اور پورا قطعہ زبانی پڑھ دیا (ص۲۳)۔

- مؤلف نے نظیری نیشاپوری کا ایک شعر پڑھا، جس کا ایک مصرع ہے:

ثمری داد نخلِ من اگر بر خاری بستم

جہانگیر نے مؤلف سے پوچھا: ''نخل برخار بستن'' کے کیا معنی ہیں؟ مؤلف نے کہا ''دخل موجّہ'' ہے (ص۴۰)۔

-مؤلف تہ دل میں نظیری نیشاپوری کے بارے میں مثبت رائے نہیں رکھتے تھے اور انھوں نے نظیری کے اشعار پر تنقید کی ہے۔ وہ نظیری کے مقابلے میں امیر خسرو کو زیادہ توانا شاعر سمجھتے (ص۱۵۵)۔ یہ بحث مقالے میں آگے چل کر تفصیل سے آئے گی۔

-وہ شعری تنقید کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ دربار میں مولانا روز بہ شیرازی اور تقیا شوشتری جہانگیر کے بنائے ہوئے حوض کے لیے تاریخی قطعات پڑھ رہے تھے۔ مؤلف کے بقول ''تقیا کے قطعے میں ہر شعر دوسرے شعر سے زیادہ پست اور بُرا تھا'' (ص۳۸)۔ جہانگیر نے مؤلف سے پوچھا: ''تقیا کی شاعری زیادہ بری ہے یا روز بہ کی؟'' عبدالستار نے جواب دیا: ''تقیا کے قطعے کی برائی لفظی اور روز بہ کے کلام کی برائی معنوی ہے کہ یہ لفظی سطح پر پست ہے اور وہ معنوی لحاظ سے بُرا ہے'' (ص۳۹)۔ یہاں دو نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ایک نقد شعر میں مؤلف کی صلاحیت اور دوسرا یہ کہ جہانگیر اسے شعری مسائل میں صاحبِ نظر سمجھتا تھا اور اس کی تنقید اور نظریات پر اعتماد کرتا تھا۔

- راجہ منوہر، قوم کچھواہہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ قوم شعر و سخن سے کوئی نسبت نہیں رکھتی، کیونکہ یہ پہاڑوں اور صحراؤں میں رہنے والی ہندوؤں کی سب سے زیادہ جنگلی اور دیہاتی قوم ہے۔ مؤلف نے شاعری میں راجہ منوہر کے مرتبے کے بارے میں کہا: ''موجودہ دَور میں وہ شاعری اور شعرشناسی میں نازک پسند دوستوں میں تسلیم شدہ ہے۔'' (ص۶۶-۶۷)

- دربار میں ایک مناظرے میں فرنگی پادری فارسی زبان میں کم علمی کی وجہ سے بے بس ہو گیا تھا۔ مؤلف نے جلدی سے اس کی مدد کی اور اس کے لیے فارسی میں ترجمہ کیا اور بات اس طرح بیان کی جیسا وہ چاہتا تھا (ص۳۱)۔

-مؤلف کا طریقۂ کار یہ تھا کہ جب کبھی وہ جہانگیر کی خدمت میں کوئی داستان یا کتاب پڑھنا چاہتے تو پہلے جہانگیر کے لیے کوئی دعائیہ شعر پڑھتے (ص۱۰۱)۔

-اگرچہ مؤلف شاعری کا ذوق رکھتے تھے لیکن شاید خود کم شعر کہتے تھے یا نہیں چاہتے تھے کہ شاعر کی حیثیت سے پہچانے جائیں۔ مثلاً: ۱۵ شعبان ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء کو- کہ شب برات ہوتی ہے- چراغاں کیا ہوا تھا اور مؤلف نے صرف اس لیے اس کے نظارے کی خوبیاں بیان کرنے سے قلم کو روکے رکھا کہ لوگ اسے شیخی بگھارنا نہ سمجھیں اور وہ شاعری کی تہمت سے بچے رہیں (ص۱۰۷)۔ وہ جہانگیر کی شان و شوکت کو اس لیے بیان نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ''میں شاعر نہیں ہوں کہ عبارت آرائی کروں، اس کی تعریف بیان سے باہر ہے۔'' (ص۱۹۳)

-مؤلف کبھی کبھار صرف شعر کی اصلاح دینے پر اکتفا کرتے تھے۔ کیفی گپی نے جہانگیر کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا تھا جو اِس شعر پر ختم ہوتا تھا:

الٰہی تا کہ خاک و باد و آتش را بقا باشد

بہ شادی بگذرانی عمر ودایم شادمان باشی

جہانگیر چاہتا تھا کہ پہلے مصرعے میں ''آب'' بھی شامل ہو، لیکن شاعر یہ تصرّف نہ کر سکا۔ اس وقت عبدالستار نے شعر کی یوں اصلاح کی:

بود تا خاک و باد و آب و آتش را بقا یارب
بہ شادی بگذرانی عمر ودایم شادمان باشی

جہانگیر نے اس کی تبدیلی اور اصلاح کو پسند کیا (ص ۱۶۵-۱۶۷)۔

-جہانگیر نے ایک شعر کہا:

خوش جامہ زیب گشت تن خوبِ نازکت
چون مینۂ لطیفِ سفید و سیاہ و سرخ

مؤلف نے پہلا مصرع شاید دانستہ اور اصلاح کی غرض سے بادشاہ کی خدمت میں اس طرح دہرایا:

خوش جامہ زیب گشت تن خوب و نازکت

بادشاہ نے اعتراض کیا اور کہا: ''تنِ خوب نازکت'' کیونکہ معشوق مؤنث ہے۔ مؤلف نے اس تعلیم اور اصلاح کو قبول کیا۔ (ص ۱۶۹-۱۷۰)

-جہانگیر نے اپنا ایک اور شعر پڑھا:

از من متاب رخ کہ نَیم بی تو یک نَفَس
یک دل شکستنِ تو بہ صد خون برابر است

مؤلف نے بادشاہ کی خدمت میں- اگر اسے خوشامد نہ سمجھا جائے- اپنی رائے کا اس طرح اظہار کیا: ''یہ شعر اپنے کہنے والے کی یاد دلاتا ہے اور اپنے شاعر جیسا ہے۔'' (ص ۲۴۹)

-ماکو قوّال نے دربار میں مشفقی شاعر کا ایک شعر پڑھا۔ جہانگیر نے مؤلف سے پوچھا: مشفقی کا تعلق کہاں سے ہے؟ مؤلف نے جواب دیا: ''بخارا سے۔'' (ص ۲۶۰)

-ٹھٹھہ کے امیر ابوالقاسم نے جہانگیر کی خدمت میں ایک غزل پڑھی۔ مؤلف نے اس پر یوں تنقید کی: ''اس کا خیال اچھا تھا لیکن اس کی نظم نارسا اور گنواروں جیسی ہے۔'' (ص ۲۶۸)

-مؤلف جہانگیر کی خدمت میں مختلف کتابیں پڑھتے تھے۔ جیسے **ترجمۂ جاویدان خرد**، حضرت ابراہیم کے دین کے بارے میں ایک کتاب جسے **صحفِ ابراہیم** کہتے ہیں اور یوسف یہود نے جہانگیر کی خواہش پر اس کا فارسی ترجمہ کیا تھا۔ (ص ۹۰، ۲۶۸)

-وہ مشایخ سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کے حالات جہانگیر کی خدمت میں بیان کرتے رہتے تھے (ص ۱۶)، خاص طور پر چشتیہ سلسلے کے مشایخ اور بزرگوں کے واقعات بیان کرتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ خود جہانگیر چشتی

مشائخ سے عقیدت رکھتا تھا۔

-ملفوظات جہانگیر یعنی **مجالس جہانگیری**، **فوائد الفواد** کی طرز پر لکھی گئی ہے جو سلسلۂ چشتیہ کے نام ور ترین شیخ خواجہ نظام الدین اولیاء بدایونی (۶۳۴-۷۲۵ھ) کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے ایک اور چشتی نجم الدین حسن بن علاء سجزی دہلوی (۶۵۱-۷۳۷ھ) نے جمع کیا ہے (ص۲، ۱۱۳)۔

-مؤلف نے ایک مرتبہ سراج عفیف، کہ یہ بھی چشتی نظامی تھے، کی کتاب سے خواجہ نظام الدین اولیاء کی حکایت جہانگیر کی خدمت میں بیان کی (ص۱۰)۔

-مؤلف نے امیر خسرو کے حال پر خواجہ نظام الدین اولیاء کی خصوصی توجہ کی تفصیل بھی جہانگیر کے حضور بیان کی (ص۱۳۷)۔

-مؤلف نے لال متی نامی ایک درویش سے ملاقات کی اور اس کی سادگی اور لاتعلقی سے متاثر ہوئے اور اسے جہانگیر کے دربار میں بھی حاضر کیا (ص۱۶)۔

-شیخ عبداللہ سرمست برہانپوری سہروردی جو ''زمانے کے رند تھے اور وقت کے نشیب و فراز سے آگاہ تھے''، مؤلف ان کو دلاسا دے کر دربار میں لے گئے (ص۱۹)۔

مؤلف علم فقہ سے واقف تھے اور ایک دفعہ جانوروں کے حلال و حرام ہونے کے بارے میں دلائل بیان کیے (ص۱۴۹-۱۵۱)۔

اکبر کے دربار سے مؤلف کا تعلق اور جہانگیر سے قربت

مؤلف کا جہانگیر کے باپ، اکبر بادشاہ (۹۶۳-۱۰۱۴ھ/۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) کے دربار میں موجود ہونا، اسی کے قول سے ثابت ہے: ''کمترین مریدان...ہم بی واسطہ از زبان مقدس حضرت عرش آستانی شنودہ ام۔'' (ص۹۲) میں نے بھی بلا واسطہ حضرت عرش آستانی کی زبانِ مبارک سے سنا ہے۔

سمرۃ الفلاسفہ کے مقدمے میں بھی کہتے ہیں کہ اکبر نے انھیں حکم دیا: فرنگی زبان سیکھو اور اس قوم کے اسرار اور اس گروہ کے بادشاہوں اور یونانی و لاطینی حکماء کے احوال ان کی کتابوں کے حوالے سے فارسی میں بیان کرو۔ (۵) چنانچہ انھوں نے پادری زیرو بنموشویر سے چھ ماہ کے عرصے میں فرنگی زبان سیکھی (۶) جو تازہ تازہ فرنگ سے آکر دربار سے وابستہ ہوا تھا۔ عبدالستار اکبر کے دربار میں فرنگی کتب کا ترجمہ کرتے تھے۔ ان کی کتب **مرآۃ القدس یا داستانِ مسیح** (۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء) اور **داستانِ احوال حواریان یا وقایع حواریان دوازدہ گانہ** (۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) پرتگالی سے فارسی میں ترجمہ شدہ ہیں۔ **وقایع حواریان دوازدہ گانہ** کے ایک حصے کا ترجمہ اکبر کی وفات سے چند ماہ قبل ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء میں اکبر کو پیش کیا گیا تھا۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عبدالستار اکبر کے آخری وقت تک دربار کے مترجم رہے اور اس کی وفات کے بعد اس کے جانشین- جہانگیر- سے وابستہ ہو گئے۔ **مجالسِ جہانگیری**، جہانگیر کی تخت نشینی کے چوتھے سال-۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء-کے واقعات سے شروع ہوتی ہے۔ اکبر کے ساتھ ان کی دیرینہ قربت کے بغیر جہانگیر کے دربار سے ان کا تعلق اور مستقل

حضوری نہیں ہوسکتی تھی۔

جہانگیر کے ساتھ مؤلف کی عقیدت اور قربت **مجالسِ جہانگیری** کے ہر صفحے سے ظاہر ہے۔ وہ خود کو جہانگیر کا ''کمترین مریدان و کہترین مجلسیان'' اور اسے جہانکشا بادشاہ اور ایک روحانی اور معنوی شخصیت ''پیر و مرشد رہنما، مظہر خوارق و کرامت، سجادہ آرائے ہدایت'' اور ''پیرِ خود'' اور ''پیر جہانگیر'' سمجھتے ہیں۔ (ص ۱، ۲) جہانگیر کے ساتھ مؤلف کی قربت کو اس بات سے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ خود کہتے ہیں کہ جو اہم باتیں جہانگیر وقتاً فوقتاً اور دَم بہ دَم کہتا، انھیں لکھنا اس کو میسر تھا اور وہ جہانگیر کی رات کی محفلوں میں موجود رہتے (ص ۲)۔

جہانگیر کو بھی ان پر اعتماد تھا، اس وجہ سے جب مؤلف نے بادشاہ سے درخواست کی کہ جن باتوں کا ان کی رات کی مجلسوں میں ذکر ہوتا ہے انھیں لکھ لیا جائے تو جہانگیر نے ان کی خواہش کو ردّ نہیں کیا (ص ۲)۔ چونکہ جہانگیر کی رات کی مجالس کی روداد لکھنا مؤلف کی ایک طرح سے ذمہ داری تھی اس لیے جہانگیر اکثر خود انھیں مجلس میں بلا لیتا اور یاددہانی کراتا: ''تم ہمارے واقعات لکھتے ہو اور موجود نہیں رہتے کہ مقدّس محفل کے احوال سے باخبر رہو...'' (ص ۱۱۰)، چونکہ جہانگیر بھی اپنے واقعات **جہانگیر نامہ** میں لکھ رہا تھا، اس نے عبدالستّار کو یہ ذمہ داری سونپی کہ جو کچھ **جہانگیر نامہ** میں شامل کیے جانے کے لائق ہے وہ اس کے دبیر-خانِ اعظم-تک پہنچا دیا کرے (ص ۴۳)۔ مؤلف کوشش کرتے تھے کہ نئے نئے واقعات اور باتیں جہانگیر کی خدمت میں عرض کریں جیسے سلطان صلاح الدین ایوبی کی فرنگیوں کے ساتھ جنگ کا واقعہ بہت عجیب تھا (ص ۳)۔ جہانگیر کبھی کبھار نجی باتیں بھی مؤلف کے ساتھ کر لیتا اور مؤلف اسے لکھ لیتے۔ جیسا کہ جہانگیر نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اس نے اب تک دو بار افیون کو پانی میں حل کر کے پیا ہے اور اس محلول کا اپنا ہی لطف ہے! (ص ۱۲)۔ ایک دفعہ مؤلف کو کھانسی کی شکایت تھی۔ جہانگیر نے خاص طور پر ان کی احوال پرسی کی اور درباری طبیب، حکیم حمید احمد آبادی سے ان کی بیماری اور علاج کے بارے میں ذاتی طور پر مشورہ کیا (ص ۱۸۸)۔ اس قربت کے باوجود مؤلف جہانگیر کی مجلس اور دربار کے آداب کا خیال رکھتے تھے اور حکم کے بغیر آگے نہیں بڑھتے تھے اور بات نہیں کرتے تھے (ص ۳۱)۔ مؤلف نے اس حدیث کے مطابق کہ ''صدقہ عمر کو بڑھاتا ہے'' مبلغ چالیس جہانگیری سکّے جہانگیر کی سلامتی کے لیے نذر کیے (ص ۲۶۹)۔ جہانگیر مؤلف کی بے تعصّبی اور راست گوئی پر ان کی تعریف کرتا تھا (ص ۳۶)۔ کبھی کبھار جہانگیر مؤلف کی زبان سے مسائل اور واقعات خاص طور پر حاضرین دربار کو سنواتا (ص ۱۴۸-۱۴۹)۔

جہانگیر نے **جہانگیر نامہ** میں دو بار عبدالستّار کا ذکر کیا ہے۔ پہلی بار تخت نشینی کی بارہویں سالگرہ (۱۰۲۶ھ/۱۶۱۷ء) کے واقعات کے ضمن میں سرسری طور پر لکھا ہے کہ ۱۶ شہریور کو میں نے ملاّ عبدالستّار کو بھی ایک ہاتھی عطا کیا۔ (۷) دوسری بار اس کا ذکر کچھ تفصیل اور کیفیت کے ساتھ ہوا ہے۔ جہانگیر ان تحفوں کے بارے میں بیان کرتا ہے جو دربار کے مقربین نے تخت نشینی کی چودھویں سالگرہ (۱۰۲۸ھ) کے موقع پر اس کی خدمت میں پیش کیے تھے:

> ''درین ولا عبدالستّار مجموعہ ای بہ خط خاصّ حضرت جنت آشیانی-انارالله برہانہ-مشتمل بر بعضی از دعوات و مقدّمہ از علم تنجیم و دیگر امور غریبہ کہ اکثری را آزمودہ و بہ حقیقت وارسیدہ، در آن جریدۂ سعادت ثبت

فرمودہ اند، بہ رسم پیش کش گذرانید۔ بعد از زیارت خط مبارک ایشان ذوقی ونشاطی در خود مشاہدہ نمودم کہ خود را کم بہ آن حال یاد دارم۔ بہ غایت الغایت محظوظ گشتم۔ بہ خدا کہ ہیچ تحفۂ نادر و جواہرِ گران بہا پیش من بہ آن نمی رسد۔ بہ جلد وی این خدمت، منصب او از آنچہ در متخیّلۂ او نگذشتہ بود، افزودہ، ہزار روپیہ انعام فرمودم۔'' (۸)

ترجمہ: اسی اثناء میں عبدالستّار نے حضرت جنت آشیانی (ہمایوں بادشاہ) - خدا ان کی دلیل ان کی زبان پر لائے - کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مجموعہ بطور نذر پیش کیا جس میں انھوں نے کچھ دعائیں اور علمِ نجوم کی ابتدائی باتیں اور دیگر مخفی علوم، جن میں سے اکثر ان کے آزمودہ تھے، تحریر کر رکھے تھے۔ ان کی مبارک تحریر کی زیارت سے میں نے اپنے آپ میں ایسا ذوق وسرور محسوس کیا کہ مجھے ویسی حالت کم یاد پڑتی ہے۔ میں انتہائی محظوظ ہوا۔ بخدا! کوئی نادر تحفہ اور قیمتی ہیرا بھی میرے نزدیک اس کے برابر نہیں ہے۔ اس خدمت کے عوض میں نے عبدالستّار کا منصب اتنا بڑھا دیا کہ خود اس کے وہم وخیال میں بھی نہ ہوگا اور ایک ہزار روپیہ انعام بھی دیا۔

چونکہ یہ قلمی نسخہ جہانگیر کے دادا نصیرالدین ہمایوں بادشاہ کے ہاتھ کا تھا، جہانگیر کے لیے اس سے بڑھ کر تحفہ اور کیا ہوسکتا تھا۔

دربار کی دیگر اہم شخصیات اور معاصر شاعروں کے ساتھ مؤلف کے تعلقات

- مؤلف نے خان جہاں لودھی کے بارے میں مثبت رائے پیش کی ہے جو ان کے اچھے تعلقات کی دلیل ہوسکتی ہے (ص ۱۹)۔

- خانِ اعظم، مؤلف کے عیسائیت کے مطالعات کی صلاحیت سے آگاہ تھا اور اس نے دربار میں پادریوں اور علمائے اسلام کے درمیان بحث ومباحثے میں جہانگیر کو یاد دلایا کہ عبدالستّار ان معاملات میں بہت آگاہی رکھتے ہیں (ص ۳۰)۔ پھر اس بحث میں پادریوں کے سامنے عبدالستّار کی حوصلہ افزائی بھی کرتا تھا (ص ۳۲)۔ خان اعظم کبھی کبھار مؤلف سے اپنے نجی حالات بھی بیان کرتا تھا (ص ۱۰۵)۔

- دیانت خان بھی کبھی کبھار مؤلف کے سامنے دردِ دل بیان کر لیتا تھا (ص ۱۸۷)۔

- ایک مرتبہ مؤلف نے ابھی دربار میں کوئی بات نہیں کی تھی اور بادشاہ کی خدمت میں کوئی واقعہ بیان نہیں کیا تھا کہ جہانگیر نے نقیب خان سے، جو دربار میں وقایع خوانی کرتا تھا، پوچھا کہ جو کچھ عبدالستّار کہتے ہیں، سچ ہے یا جھوٹ؟ نقیب خان نے کہا: جھوٹ ہے! مؤلف نے اعتراض کیا اور کہا: ''پہلے نقیب خان کو پوچھنا چاہیے تھا کہ عبدالستّار کیا کہتا ہے۔ خان ابھی نہیں جانتا کہ میں نے کیا کہا ہے'' (ص ۸۱)۔ شاید مؤلف کے ساتھ نقیب خان کے روابط اچھے نہیں رہے۔ جو نادر اور دلچسپ حکایات مؤلف نے تاریخی اور فرنگی کتابوں میں پڑھی تھیں اور مجلس میں جہانگیر کے لیے دہراتے تھے، وہ نقیب خان کے لیے نئی اور ناقابلِ یقین ہوتی تھیں (ص ۳)۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نقیب خان کی یہ بے یقینی عبدالستّار سے عناد

یا ضد کی وجہ سے ہو۔

-تقیا شوشتری نے، جو جہانگیر کے دربار میں اس کے لیے کلامی اور فقہی مسائل بیان کرتا تھا، اس سوال پر کہ باپ کے گناہ پر بیٹے کو پکڑا جا سکتا ہے؟ کہا تھا کہ ہاں پکڑا جا سکتا ہے۔ بادشاہ نے عبدالستار کی رائے جاننا چاہی۔ انھوں نے کہ جو کچھ تقیا شوشتری کہتے ہیں، وہ نہ از روے عقل انصاف پر مبنی ہے اور نہ از روے روایات صحیح ہے۔ پھر اپنی دلیل بیان کی (ص ۸۸-۸۹)۔

-تقیا شاعر بھی تھا۔ ان کی شاعری کے بارے میں مؤلف کی رائے پہلے بیان ہو چکی ہے۔ مؤلف نے تقیا شوشتری کو ''ناکارہ متاع کا حامل خود پرست دعویدار'' کہا ہے (ص ۳۹)۔ ایک اور جگہ پر اسے ضرورت مند درماندہ، پریشان اور خستہ حال شخص کہا ہے (ص ۴۱-۴۲)۔ یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ عبدالستار تقیا شوشتری کے بارے میں مثبت رائے نہیں رکھتے تھے۔

-نظیری نیشاپوری، جو اپنے زمانے کے ممتاز شاعر تھے اور ہندوستان کے درباروں سے صلہ یافتہ تھے، مؤلف نے ان کے ذکر میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں، ان سے نظیری کے بارے میں ان کی سرد مہری اور ایک طرح کی لاتعلقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے نظیری کو بہت معمولی شاعر ظاہر کیا ہے: ''آج رات نظیری نام ایک شاعر... باریاب ہوا... رحم دل بادشاہ نے اس کے بڑھاپے، گوشہ نشینی اور مسکینی کے پیشِ نظر اس پر عنایت کی... پھر اس نے انوری کی زمین میں ایک قصیدہ پڑھا... اور عرض کیا کہ انوری کے بعد بہت سے لوگوں نے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اس نئے پن اور تازگی کے ساتھ کسی نے نہیں کی۔ اس کی یہ باتیں محض شاعری تھیں۔'' (ص ۱۵۳)

جہانگیر نے اس کا ۱۱۴۰ اشعار کا قصیدہ ''بڑی مروّت، بردباری اور ذاتی شرم وحیا'' کے سبب سنا اور انعام دیا اور ''بادشاہ سلامت نہیں چاہتے تھے کہ اس کی اعلیٰ مجلس میں اس کا دل ٹوٹ جائے۔'' (ص ۱۵۴) یعنی نظیری کے اس قصیدہ میں کوئی کمال نہیں تھا اور بادشاہ نے محض حوصلہ افزائی اور دلجوئی کے لیے اسے انعام دیا!

جہانگیر نے امیر خسرو کی ایک غزل، جس کا قافیہ ''سفید و سیاہ و سرخ'' تھا، ملاّ نظیری کو دی کہ اس کی تقلید میں شعر کہے: ''جہانگیر نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اس پر غزل کہی جائے۔ لیکن بہت مشکل ہے کہ اس ظالم (یعنی خسرو) نے کچھ چھوڑا ہی نہیں! کوئی کیا سوچے اور کیا کہے۔ ملاّ [نظیری] نے چند ادائیں دکھا کر خدمت اقدس میں یوں ظاہر کیا گویا اس غزل کے جواب میں غزل کہنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ نرگسیت کے شکار اس دعویدار کو بہت سوچ بچار اور باریک بینی کے بعد معلوم ہوا [کہ یہ اس قدر آسان بھی نہیں] اور وہ اسے آسان سمجھنے اور سرسری لینے پر شرمندہ ہوا... آخر وہی ہوا جو زبانِ اقدس سے نکلا تھا۔ ملاّ نظیری اس کے تیسرے دن، دس بارہ شعر کہہ کر لایا لیکن ایک بھی ایسا مصرع کہنے میں کامیاب نہ ہو سکا جسے نازک پسند اہل نظر قبول کر سکیں۔ خسرو نے اس غزل میں جس مشکل گوئی کا اہتمام ملحوظ رکھا ہے، نظیری اسے ملحوظ نہ رکھ سکا۔'' (ص ۱۵۵-۱۵۶)

ایک مقام پر خان خانان کا ایک قول نقل کیا ہے کہ ''ملاّ نظیری شاعر ہے اور بس'' (ص ۱۸۹)۔

تصانیف:۔

عبدالستار کی کتابیں دو طرح کی ہیں۔ ایک عیسائیت کے بارے میں، جو انھوں نے پادری زیرونموشویر کے ساتھ مل کر پرتگالی زبان سے فارسی میں ترجمہ کی ہیں۔ دوسری وہ جو انھوں نے انفرادی طور پر تالیف کی ہیں۔ یہاں دونوں طرح کی کتابوں کا تعارف تاریخ تصنیف/ترجمہ کی ترتیب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے:

ا۔ ثمرۃ الفلاسفہ یا احوال فرنگستان

یہ روم، یونان اور وہاں کے فلسفیوں کے حالات اور اقوال کے بارے میں ہے۔ یہ ۱۳ ربیع الاوّل ۱۰۱۲ھ/۱۱ اگست ۱۶۰۳ء کو تالیف ہوئی اور اکبر بادشاہ کو پیش کی گئی۔ (۹)

آغاز:

''سپاس الٰہی و ستایش جان آفرین در آغاز نامہ ہا رسمی است پیشین، ورنہ ساختہ را چہ نیرو کہ از سازندۂ خویش گوید و نو شدہ را چہ یارا کہ از پادشاہ قِدَم سراید۔''(۱۰)

انجام:

''و این خرد زادۂ نہ ماہ را کہ پیران کہن سال را تجربہ آموز و تجربہ کاران را روشنی افروز است و از حضرت شاہی نامی و اسم گرامی **ثمرۃ الفلاسفہ** نامور بہ حرمت گیتی خداوند پیرایۂ قبول ارزانی دارد۔ فقط۔''(۱۱)

کتاب سے ملنے والی اہم معلومات یہ ہیں:

الف۔ بادشاہ کا نام پورے القاب کے ساتھ یوں درج کیا ہے:

''حضرت ظلّ الٰہی، ارشاد پناہی، سابقہ سالارِ محبت کلّ، شاہسوار عرصۂ توکّل، ضابطۂ مراتب امکان و وجوب، حافظ مدارج اطلاق و تقیّد گنجور اسرارِ الٰہی، مہبط انوار نامتناہی، خداوند تخت دیہیم، پادشاہ ہفت اقلیم، جلال الدّین والدّنیا اکبر پادشاہ غازی خلد اللّٰہ ملکہ و سلطانہ۔''(۱۲)

ب۔ اکبر بادشاہ ہمیشہ اس خواہش کا اظہار کرتا کہ اس کے دربار میں مختلف مذاہب کے اسرار، ہر سرزمین کے حکمرانوں کے حالات اور داناؤں کی حکمت کے راز بیان ہونے چاہیں تا کہ ہر جماعت اور گروہ کی کسوٹی معلوم ہو اور اس کے ردّ و قبول سے ایک نیا دستور العمل بنایا جائے اور دور و نزدیک کے لوگ بہرہ ور ہوں۔ چنانچہ مؤلف کو بلایا اور حکم دیا کہ فرنگی زبان سیکھو اور یونانی اور لاطینی بادشاہوں اور داناؤں کے حالات ان کی کتابوں سے فارسی میں ترجمہ کرو۔ مؤلف نے ہمت کی اور دربار کے ایک دانائے فرنگ زیرونموشویر سے دوستی قائم کی اور اس سے زبان سیکھی۔ چھ ماہ میں فرنگی زبان سے علمی اور عملی مضامین کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر لی۔ اگرچہ محاورے کی کمی اور ترجمے کے شغل کی وجہ سے اس پر کما حقہ قدرت تو حاصل نہ ہو سکی لیکن بادشاہ سلامت کی خواہش پوری ہو گئی۔ (۱۳)

ج۔ یہ کتاب روم اور دیگر سات بادشاہوں کی سلطنت کے ذکر میں ہے۔ رومیوں کے اپنے ملک کے نام سے لفظِ ''سلطنت'' حذف کر دینے کا بیان بھی ہوا ہے۔ (۱۴) کتاب کا آخری موضوع ''امر نام شاعر'' ہے۔ (۱۵)

د۔ خاتمۂ کتاب میں تاریخ تصنیف (ترجمہ) ۱۳ ربیع الاوّل، ۱۰۱۲ھ/۱۲۹ مرداد الٰہی ۳۸ جلوس بیان ہوئی ہے۔ (۱۶)

مؤلف نے جابجا شعرا کے اشعار بھی شامل کیے ہیں۔ کہیں شاعر کے ذکر کے ساتھ اور کہیں اس کے بغیر۔

سمرۃ الفلاسفہ کا ایک قلمی نسخہ برٹش لائبریری لندن Or. 5893 میں محفوظ ہے۔ خطِ نستعلیق میں لکھے گئے اس نسخے کے کاتب کا نام شیخ خیرالدین ہے۔ تاریخ کتابت ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ، ۲۷۹ صفحات۔ (۱۷)

اس کتاب کے دیگر نسخے کنگز کالج کیمبرج (Browne, Suppt. 770)، مانچسٹر (Lindesiana, p. 177, no. 445)، وکٹوریا لائبریری پٹیالہ (Maclagen, p. 218, no. 16) گورنمنٹ لائبریری آندھرا پردیش (سابقہ آصفیہ لائبریری) حیدرآباد دکن، (فہرست آصفیہ، ج ۱، ص ۳۴۶، نمبر ۱۱۸، ۱۶۹)؛ اور آستان قدس رضوی مشہد (ایران) (فہرست، ج ۳، ص ۸۷) اور علی گڑھ یونیورسٹی (نمبر FA.28، بحوالہ فہرست، ص ۱۸۳) میں موجود ہیں، (۱۸)

۲۔ مرآت القدس

پادری زیرونموشویر نے ۱۵ اردیبہشت [۱۰۱۰ھ]/ ۱۶۰۲ء کو عبدالستّار بن قاسم لاہوری کی معاونت سے آگرہ میں اکبر بادشاہ کے لیے اس کا فارسی ترجمہ کیا۔ ترجمہ میں معاونت کا ذکر پادری مترجم نے لندن کے نسخے کے آخر میں ایک یادداشت میں کیا ہے۔ اس کتاب کے ۱۱ خطی نسخے اب تک معلوم ہوئے ہیں۔ (۱۹) ہم نے ان میں سے دو نسخوں - ایک لاہور عجائب گھر (نمبر M.S.46) اور دوسرا برٹش لائبریری، لندن (نمبر I.O. Islamic 94) - سے استفادہ کیا ہے۔ (۲۰) دونوں نسخوں کی عبارت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

لندن کے نسخے کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے:

''بسم الاب والابن والروح القدس الاہ واحد مرآت القدس، کہ در آن گزارش می یابد داستان عجیب احوال حضرت ایشوع کریستن و بیان پارہ ای تعلیم آسمانی و معجزہ ہای بلند قدر او۔''

سبب تألیف جو بیان ہوا ہے اس کا ملخص یہ ہے:

جب بادشاہ سلامت [اکبر] نے حضرت عیسیٰ کے حالات اختلاف کے ساتھ سنے تو اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ حضرت عیسیٰ کے مصدقہ حالات سننا چاہتے ہیں اور پادری زیرونموشویر کا حکم دیا کہ جو کچھ حضرت عیسیٰ کے اقوال اور کردار کے بارے میں کتب میں لکھا ہے، اسے فارسی میں منتقل کر کے پیش کیا جائے۔ بادشاہ کا حکم بجالایا گیا۔ لیکن جب پادری نے اپنی فارسی تحریر کا لاطینی مآخذ سے تقابل کیا تو تسلی نہ ہوئی اور وہ سارا مسودہ ناقص معلوم ہوا اور نظر ثانی کر کے اس قابل بنایا کہ بادشاہ کے حضور پیش کیا جا سکے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں حضرت عیسیٰ کی ولادت سے لے کر تعلیم کے آغاز تک کے حالات، دوسرے باب میں ان کے معجزات اور عجائبات، تیسرے باب میں ان کی وفات اور تکالیف کا ذکر ہے جو لوگوں کی سلامتی اور محبت میں برداشت کیں، چوتھے باب میں ان کا قبر سے اٹھنا اور آسمان کی طرف جانے کا بیان ہے۔ اس کتاب کا زیادہ تر مواد انجیل مقدس سے لیا گیا ہے اور دوسری تحریروں سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ ہر بات کا مأخذ حاشیے میں دیا

گیا ہے۔اس کتاب میں بیان کردہ بعض باتیں انسانی عقل وفہم سے ماوراء ہیں،ایسی تمام باتوں کی وضاحت کتاب **آئینۂ حق نما** کی جائے گی،**مرآت القدس** ۱۵اردی بہشت ۱۶۰۲عیسوی کا آگرہ میں اختتام پذیر ہوئی۔(۲۱)

اختتام کتاب:

''باری ہیچ کس اوراخندان ندید،امّا گریان۔بلی کشیدہ قد،دست ہای اوراست ودرست،بازوش خوش نما، درگفتن سنجیدہ وگران وکم گوی،خوش روی درآدمی زادگان۔''(۲۲)

لندن کے نسخے کے اختتام پرایک یادداشت میں پادری نے ترجمے میں عبدالستّار کی معاونت کا یوں ذکر کیا ہے:

''این نامۂ گرامی ودیباچۂ سعادت، بندہ پادری زیرونموشویر فرنگی از طائفہ صحبت [!] حضرت عیسٰی بہ حکم شاہنشاہ دوران، خدیوروشن جان، برای روزگار [!] جلال الدین اکبر پادشاہ- خلداللّٰہ ملکہ وسلطانہ- از انجیل مقدس ودیگر کتب پیغمبران دردارالخلافہ آگرہ فراہم آوردہ۔مولانا عبدالستّار بن قاسم لاہوری بہ اتفاق این بندہ درہمان دارالخلافہ آگرہ ترجمہ کرددرسنۂ ہزاروشش صدودوازولادت حضرت ایشوع مسیح،وچہل و ہفت الٰہی انجام یافت۔تحریرفی التاریخ ہشتم ماہ رمضان المبارک درروز چہارشنبہ سنۂ ہزاروبیست وہفت۔'' (۲۳)

لندن کانسخہ شیخ افاضت اللہ کے قلم سے ۱۱۸۵ھ میں کلکتہ میں تحریر ہوا۔(۲۴) لاہور کے نسخے کی تاریخ کتابت نسخے کے ناقص ہونے کی وجہ سے معلوم نہیں ہے۔لیکن سرورق کی ایک یادداشت سے پتا چلتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۰۱۳ھ میں لکھا گیا اورلگتا ہے شاہی کتب خانے کے لیے تیار ہوا تھا۔

۲۷صفر ۱۰۱۹ھ/۱۱مئی ۱۶۱۰ء کی ایک شبانہ مجلس میں جہانگیر نے خان اعظم کو بتایا کہ آج سے پانچ چھ روز پہلے عبدالستّار شاہی مجلس میں حضرت عیسٰی کے وہ حالات پڑھ رہے تھے جوانھوں نے درباری پادریوں کے تعاون سے،انجیل اورنصاریٰ کی دیگر کتب سے فارسی زبان میں ترجمہ کیے تھے(ص۳۴)،بظاہر یہ مرآت القدس کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ داستانِ احوالِ حواریان یاوقایع حواریان دوازدہ گانہ

زیرونموشویر نے **مرآت القدس** کی تألیف اورترجمے کے بعدعبدالستّار کی معاونت سے اس کتاب کا بھی فارسی ترجمہ کیا اور بظاہرتھوڑا تھوڑا کرکے اکبراور جہانگیر کے سامنے پیش کرتا رہا۔اس طرح کہ چار حواریوں کے حالات ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء میں اکبر بادشاہ کو اس کی وفات سے پہلے پیش کیے جا چکے تھے۔اور کتاب کی حتمی تحریر(ترجمہ) ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء میں جہانگیر کوپیش کی گئی۔اس کتاب کا ایک حصّہ شایع ہوا ہےاورمتعدد خطّی نسخے بھی موجود ہیں۔(۲۵)

۴۔ مجالس جہانگیری

۱۰۱۷ھ سے ۱۰۲۰ھ(۱۶۰۸-۱۶۱۱ء) تک کی جہانگیر کی شبانہ درباری مجلسوں سے متعلق ہے۔اس کے بارے میں آگے چل کرعلیحدہ بحث کی جائے گی۔

۵۔ خلاصۂ ظفرنامہ

عبدالستار نے ۲۴ آذر ۱۰۲۴ ہجری/۱۶۱۵ء کو اجمیر میں جہانگیر کی خواہش پر شرف الدین علی ''شرف'' یزدی (م: ۸۵۸ھ/۱۴۵۴ء) کی کتاب **ظفر نامہ** کا خلاصہ تیار کیا اور اس کی خدمت میں پیش کیا۔ جہانگیر نے عبدالستار کو ہدایت کی کہ جو آیات اور احادیث اصل موضوع سے مناسبت نہیں رکھتیں اور جو اشعار، فقرات اور عربی اقوال بات کو سمجھنے میں مخل ہیں، اُنھیں حذف کر دیا جائے اور ایک ایسا خلاصہ تیار کیا جائے جسے سمجھنا سب کے لیے آسان ہو۔

آغاز:

''حمد وستایش لایق بارگاہ خدای زمان و زمین و نیاز و نیایش سزاوار آفریدگار فروردین از اندازۂ عقل و قیاس وتوانایی دریافت ادراک ما کوتاہ خردان چندان بلنداست کہ دست فہم وذکای ہستی بہ دامن آن نرسد و درود انبیاء راہنما و دعای مغفرت وآمرزش آن برگزیدگان جناب کبریاء آزادہ فطرتان در آغاز نامہ ہا بنا بر رسم وآیین است آن سزاوار کہ قلم را ازاین کار سخت باز داشتہ ودانایانہ بہ ناگزیر وقت پرداختہ۔''(۲۶)

ظفر نامہ کا خلاصہ کرنے کی وجہ، جیسا کہ پہلے بیان ہوئی، عبدالستار نے اپنے دیباچے میں یہی بتائی ہے کہ اپنے موضوع پر یہ بہت عمدہ کتاب ہے لیکن اس پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ مصنّف نے غیر مانوس الفاظ استعمال کیے ہیں اور آیات اور احادیث کے بھرپور استعمال کو اپنی تحریر کی خوبی اور لطافت سمجھا ہے، یہ سوچے بغیر کہ ماضی کے بزرگوں کے حالات و واقعات لکھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عام وخاص قارئین اسے سمجھ کر کوئی سبق حاصل کر سکیں۔ چنانچہ ۲۴ آذر ۱۰۲۴ ہجری کو اجمیر میں ظلِ الٰہی (جہانگیر) نے حکم دیا کہ اس کتاب سے وہ تمام آیات اور احادیث جن کا اصل واقعات سے کوئی تعلق نہیں اور دیگر اشعار اور عربی فقرات اور اقوال جو مضامین سمجھنے میں مخل ہیں، سب کو نکال کر ایسا کیا جائے کہ یہ کتاب سب کے لیے آسان ہو اور خاص وعام اسے سن کر بہرہ ور ہو سکیں۔ یہ حکم بھی ہوا کہ یہ کام ایک دن میں مکمل ہو جانا چاہیے چنانکہ حکم کے مطابق اس مشکل اور طویل کام کو مقررہ میعاد میں ہی مکمل کر دیا گیا۔(۲۷)

تلخیص کنندہ کے دیباچے کے بعد پہلا عنوان ''گفتار در تولّد حضرت صاحبقرانی'' (۳ الف) اور آخری عنوان ''ذکر احوال سلطنت امیر زادہ (سلطان وسببِ زوال آن برسبیل اجمال' (۳۰۸ الف) ہے۔ کتاب کے اختتام پر امیر تیمور کی بعض انفرادی خصوصیات کا ذکر ہے اور اس کی اولاد کا بیان ہے جو اس کی وفات کے وقت موجود تھی (۳۰۹ ب)۔

اور پھر اشعار ہیں، جن کا مطلع یہ ہے:

''شرف'' تا بہ کی قصہ خوانی، خموش
زبان درکش و باز کن گوشِ ہوش

اور مقطع یہ ہے:

عنان را عجب دولتی داد دست
کہ دارد بہ بحر کرامت نشست(۲۸)

کتاب اس عبارت پر ختم ہوتی ہے: ''تمام شد کتاب مستطاب **ظفر نامہ** تصنیف مولانا شرف الدین علی یزدی بار

الہ [کذا: بہ حذفِ] احادیث وآیات وعبارات عربی واشعار جُنگ بہ موجب فرمودۂ حضرت جہانگیر پادشاہ بالخیر۔''

کتاب کا قلمی نسخہ برٹش لائبریری (سابقہ برٹش میوزیم) لندن (نمبر Add.16685) میں خوبصورت نستعلیق میں لکھا، موجود ہے۔ اس نسخے پر تذہیب کی گئی ہے اور سونے کی پان چڑھائی گئی ہے۔ جدولیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ ایک مہر ''امیر یعقوب ۱۲۶۰'' الفاظ کی اور ایک انگریزی مہر بھی لگی ہے جس میں تاریخ ستمبر ۱۸۰۵ کندہ ہے۔ (۲۹) دوسرا نسخہ باڈلیان (نمبر 159) میں موجود ہے جو صرف جلد اوّل ہے اور ۸۰۳ھ/۱-۱۴۰۰ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ (۳۰)

مؤلف کے سالِ حیات کا تعیّن

عبدالستّار ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء تک ضرور زندہ رہے تھے، کیونکہ اس سال انھوں نے علمِ نجوم وغیرہ کے مضامین اور اوراد پر مشتمل ہمایوں بادشاہ کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ (۳۱)

۲۔ مجالس جہانگیری کا تجزیاتی مطالعہ

کتاب کا خاکہ

مؤلف چاہتے تھے کہ وہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کے مجموعہ **فوائد الفواد** مرتّبہ حسن سجزی دہلوی کی طرز پر ''ملفوظاتِ جہانگیر'' کا ایک مجموعہ، چالیس مجالس میں تحریر کریں۔ جہانگیر کے ساتھ قربت کے باعث مؤلف کے لیے یہ آسان تھا کہ وقتاً فوقتاً اور لمحہ بہ لمحہ جو کچھ جہانگیر سے صادر ہوتا تھا اور اکابرِ دربار جسے لکھنے سے غافل تھے، اسے لکھ لیں۔ انھوں نے اپنی خواہش کا اظہار جہانگیر سے کیا اور جہانگیر نے اسے قبول کیا (ص ۲، ۱۱۳)۔

جب واقعات چالیس مجالس میں تحریر ہو چکے تو مؤلف نے ان میں سے بعض جہانگیر کے لیے پڑھے۔ جہانگیر نے یہ سلسلہ جاری رکھنے کا حکم دیا (ص ۱۱۳، ۱۱۴) اور اس طرح یہ کتاب اکلوتے نسخے کی بنیاد پر، جو ہمارے سامنے ہے، چالیس مجالس کی بجائے ایک سو بائیس مجالس میں مکمل ہوئی، یعنی ابتدائی خاکے سے تین گنا زیادہ۔ چونکہ جہانگیر کے روزمرّہ کے واقعات کے لیے رسمی تاریخ- **جہانگیر نامہ**- جہانگیر کے اپنے قلم سے لکھی جا رہی تھی، مؤلف نے وقایع نگاری میں یہ جدّت پیدا کی کہ جہانگیر کی رات کی مجالس کے واقعات لکھے (ص ۲)۔ یہ کتاب ایک لحاظ سے ''شب نامچہ'' ہے، ''روز نامچہ'' نہیں۔ مؤلف نے اسے کوئی مخصوص نام نہیں دیا یا ہمارے نسخے میں نہیں ہے۔ مؤلف کے الفاظ ''تقریب نگاشتن مجالس عالیہ...'' (ص ۲) اور ہر موضوع کے آغاز میں ''مجلس'' کے عنوان اور اس کے جہانگیر کے ساتھ تعلق کی وجہ سے ہم نے اس کے لیے ''**مجالس جہانگیری**'' کا نام موزوں سمجھا ہے اور اسے اسی نام سے شایع کیا ہے۔

تاریخ تالیف

یہ کتاب ان واقعات کی رپوتاژ ہے جو ۲۴ رجب ۱۰۱۷ھ/۲۴ اکتوبر ۱۶۰۸ سے ۱۹ رمضان ۱۰۲۰ھ/۱۵ نومبر ۱۶۱۱ء تک کی درمیانی راتوں میں جہانگیر کی مجالس میں پیش آئے اور مؤلف وہاں موجود تھے۔ مؤلف رات کے واقعات کو انھی راتوں میں لکھ لیتے جب یہ پیش آتے اور جو کچھ تیار ہو جاتا وہ بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتے۔ اس طرح کتاب کا زمانۂ

تألیف اصولاً ۱۰۱۷ھ اور ۱۰۲۰ھ (۱۶۰۸ تا ۱۶۱۱ء) کا درمیانی عرصہ ہی ہونا چاہیے۔ یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ مذکورہ واقعات متواتر اور مسلسل پیش نہیں آئے بلکہ مذکورہ سالوں کی بعض راتوں میں جو کچھ مجلسوں میں پیش آیا، قلم بند کر لیا گیا۔

مقامِ تألیف

آگرہ، سکندر لودھی (حکومت: ۸۹۴-۹۲۳ھ/۱۴۸۸-۱۵۱۷ء) کے زمانے سے سلاطین دہلی کا دارالحکومت رہا ہے۔ بابر اور اس کے جانشین ہمایوں اور اکبر نے بھی آگرہ کو اپنا دارالحکومت قرار دیا (۳۲) اور جہانگیر بھی وہاں دربار لگاتا رہا۔ اصولی طور پر اس کتاب کا مقام تألیف بھی آگرہ ہے۔ اس بات کی تائید پہلی مجلس (منعقدہ ۲۴ رجب ۱۰۱۷ھ) کی ایک عبارت سے بھی ہوتی ہے جہاں مؤلف کہتے ہیں: ''درہمین شہر آگرہ'' (ص ۳) - اسی آگرہ شہر میں - ''اِسی'' کی تاکید اس بات کی دلیل ہے کہ مؤلف اُس وقت وہاں تھے۔

طریقۂ تألیف

جو طریقہ مؤلف نے واقعات تحریر کرنے کے لیے اختیار کیا، شروع سے آخر تک اس پر کاربند رہے ہیں۔ پہلے وہ مجلس کا شمارہ لکھتے ہیں، پھر مجلس کے انعقاد کی تاریخ، قمری سال اور جہانگیر کی تخت نشینی کے سال کے ساتھ اُس کی خوش بختی کی دعا کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ یہ حصہ تحریر کرنے کے لیے مؤلف ایک روایتی عبارت لکھتے ہیں جو ہر مجلس کے آغاز میں دہرائی گئی ہے۔ اس کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں: ''بہ تاریخ...، شب...، سال... جلوس مبارک کہ بر جہان و جہانیان فرخندہ باد، مجلسیان نوبت را دولت آستان بوس روی داد، زبان بہ دعا و ثنای آن حضرت تازہ و سبز گردید۔'' کبھی مجلس کا وقت بھی لکھتے ہیں: ''دو ساعت نجومی از شب گذشتہ... و در ساعت سوّم...'' (ص ۴۷ وغیرہ) پھر حاضرینِ مجلس کا نام لیتے ہیں۔ بہت سی مجالس، جہانگیر کی عمر اور حکومت کی درازی کی دعا اور اس کی تعریف پر ختم ہوتی ہیں۔ بعض اوقات نثری دعا کے ساتھ دعائیہ اشعار کا اضافہ بھی کیا گیا ہے لیکن یہ اسلوب پوری کتاب میں نہیں ہے۔ بعض مجالس دعا کے بغیر بھی ختم ہوئی ہیں (دیکھیے: مجلس ۳۴، ۳۵، ۳۷ وغیرہ)۔ کبھی دعائیہ اشعار کی تکرار ہوئی ہے۔ مثلاً:

☆ بود در آسمان تا مہر را نور
مباد اعکس او از چتر شہ دور
(ص ۲، ۱۰۲، ۱۰۹)

☆ عمرش دراز باد کہ چرخ عطیّہ بخش
از ہر عطیّہ ای کہ دہد عمر خوش تر است
(ص ۷، ۱۲۹، ۲۵۹)

☆ ثنا گفت بر شاہ و بر بزم شاہ
کہ آباد باد از تو این بزم گاہ
(ص ۲۲، ۹۸)

☆ تابوَ د چرخ را جنوب وشمال
تابوَ د ماہ رامدار ومدیر
الیٰ آخر...
(ص ۲۳،۹۴)

☆ الٰہی تا جہان را آب ورنگ است
فلک راسیر وگیتی را درنگ است
الیٰ آخر...

اور ایک جگہ پر ہے:

خدایا تا جہان...الی آخر
(۴۲، ۷۷، ۱۰۵، ۱۵۲)

معلوم ہوتا ہے کہ تکرار کے لیے مؤلف کے حافظے میں مناسب اشعار نہیں ہیں، اسی وجہ سے تقریباً آدھی مجالس میں انھوں نے ایسے اشعار نہیں لکھے (دیکھیے: مجلس ۵، ۸، ۱۲، ۱۳، ۱۶ وغیرہ)۔

کتاب کا دوسرا نمایاں پہلو مؤلف کی جہانگیر کے لیے تعریف اور داد وستایش ہے جس سے کوئی ''مجلس'' خالی نہیں ہے۔ جو کچھ جہانگیر کی زبان سے نکلتا، مؤلف کے لیے قابلِ تحسین ہوتا۔ وہ اس کی تاویل اور وضاحت کرتے ہیں اور اس میں جہانگیر کی نکتہ یابی تلاش کرتے ہیں اور اپنے ممدوح کی گفتگو پر داد دیتے ہیں اور قاری کو خود فیصلہ کرنے کی مہلت نہیں دیتے۔ بعض اوقات اس ضمن میں اس قدر مبالغہ کیا گیا ہے کہ چاپلوسی اور خوشامد صاف نظر آتی ہے۔ مؤلف کسی واقعہ نہایت فطری انداز سے بیان کرنا شروع کرتے ہیں لیکن اچانک ہی اس کے درمیان تعریف کرنا اور دعا دینا شروع کر دیتے ہیں۔ خوشامدانہ الفاظ سے قاری بدذوق ہوجاتا ہے۔

اکبر اور جہانگیر کے دَور کے مورّخوں اور تذکرہ نویسوں جیسے محمد عارف قندھاری نے **تاریخ اکبری** (۳۳) میں، اسد بیگ قزوینی نے **حالات اسد بیگ** میں (۳۴)، مطربی سمرقندی نے **نسخۂ زیبائے جہانگیر** (۳۵) کے خاتمہ میں اور ملاّ قاطعی ہروی (م: ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء) نے **تذکرۂ مجمع الشعرای جہانگیر شاہی** (۳۶) میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے اور متن میں جگہ جگہ اپنے ممدوحین کے لیے دعائیہ جملے استعمال کیے ہیں۔ ملاّ قاطعی نے جہانگیر کے عہد کے ہر شاعر کے حالات کا اختتام، جہانگیر کی حکومت اور عمر کی درازی کی دعائیہ عبارت پر کیا ہے۔ موضوعات اور اُسلوب کے لحاظ سے **مجالسِ جہانگیری** اور خاتمۂ **نسخۂ زیبائے جہانگیر / خاطراتِ مطربی** کے درمیان بہت مشابہت ہے۔ مطربی ۱۹ ربیع الاوّل ۱۰۳۶ھ/ ۲۹ نومبر ۱۶۲۶ء کو جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی کتاب **نسخۂ زیبائے جہانگیر** اسے پیش کی۔ وہ تقریباً دو ماہ تک جہانگیر کی خدمت میں رہے اور مناسب جانا کہ جو واقعات ان دو ماہ کے دوران دربار میں پیش آئے ہیں، انھیں ''خاتمہ'' کے طور پر اپنی کتاب- **نسخۂ زیبائے جہانگیر**- میں شامل کر دے۔ مطربی نے ۹ جمادی الثانی ۱۰۳۶ھ/ ۱۶ فروری

۱۶۲۷ء کو ایسے واقعات لکھنے کا آغاز کیا اور جہانگیر کے دربار سے متعلق ۲۴ چشم دید واقعات لکھے۔ موضوعات کے اعتبار سے خاتمۂ **نسخۂ زیبائے جہانگیری** کی **مجالسِ جہانگیری** کے ساتھ اس حد تک مشابہت ہے کہ **نسخۂ زیبائے جہانگیر** کو **مجالسِ جہانگیری** کا تسلسل کہا جا سکتا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ **نسخۂ زیبائے جہانگیر** کے مؤلف چونکہ سمرقند سے تعلق رکھتے ہیں، جہانگیر اپنی متجسّس طبیعت کے پیشِ نظر ان سے زیادہ تر سمرقند کے لوگوں کے بارے میں اور وہاں کے حالات پوچھتا تھا اور مطربی جواب دیتے اور تحریر کرتے تھے۔ ایسے ثقافتی، ادبی مباحث اور مسائل جن کا تعلق برّصغیر سے تھا، بہت کم زیرِ بحث آئے ہیں۔

مجالسِ جہانگیری میں بعض باتوں کی چند جگہوں پر تکرار ہوئی ہے۔ اس تکرار کی وجہ شاید یہ ہے کہ کبھی کسی مسئلے یا نکتے کا بیان کئی راتوں تک طول پکڑتا اور مؤلف مجبوراً ان راتوں کی سرگذشت قلمبند کرتے ہوئے ان کا اعادہ کرتے رہتے۔ کبھی خود بادشاہ کو کوئی ایسا نکتہ یاد آ جاتا جو پہلے کسی مجلس میں بیان ہو چکا تھا اور مؤلف کو وہ بات یاد دلائی جاتی۔ مثلاً: کتاب کی وجہِ تصنیف (ص ۲، ۱۱۳)؛ ایک یہودی عالم کا واقعہ جو بظاہر دینِ موسوی چھوڑ چکا تھا (ص ۵، ۲۱۶)؛ شکیبی شاعر کا واقعہ (ص ۴۳، ۴۹)؛ طالب اصفہانی کا رُباعی پڑھنا (ص ۴۹، ۶۲-۶۳) عیسائیوں کا تین فرقوں میں تقسیم ہو جانا (ص ۵، ۲۱۶)؛ مردوں کا پاؤں کے تلووں پر مہندی لگانے کا مسئلہ (ص ۲۱۷، ۲۵۹)؛ پہلا ''نورشاہی'' سکّہ انی راو کو دینا (ص ۲۱۸، ۲۵۹) وغیرہ۔

مؤلف نے کتاب کے آغاز میں ہندوستان کے گذشتہ تیموری بادشاہوں کے نام دعائیہ القابات کے ساتھ لکھے ہیں۔ جیسا کہ ظہیر الدین بابر کو ''فردوس مکانی''، نصیر الدین ہمایوں کو ''جنت آشیانی'' اور جلال الدین اکبر کو ''عرش آستانی'' لکھا ہے (ص ۱۶)۔ اس کے بعد جب بھی ان کا ذکر آیا ہے، انھیں کبھی نام کے ساتھ اور کبھی صرف ان القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ تیموری عہد کی دوسری تاریخی کتابوں (مثلاً **جہانگیر نامہ، عمل صالح**) کے مطبوعہ نسخوں اور بعد کے زمانے کے ان کے مخطوطات اور مطبوعہ فرامین و اسناد وغیرہ میں اکبر کے خطاب کا املاء ''عرش آشیانی'' ملتا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں ہے کہ اصل تجویز شدہ لقب ''عرش آشیانی'' نہیں بلکہ ''عرش آستانی'' ہی تھا۔ املاء کی اس غلطی کا ارتکاب سہواً یا عمداً کاتبوں کے ذریعے عمل میں آیا۔ (۳۷) اس اعتبار سے **مجالسِ جہانگیری** کے مؤلف اور نسخہ داؤدی کے کاتب کی دقت نظر قابلِ داد ہے کہ انھوں نے ''عرش آستانی'' ہی لکھا ہے۔

مجالسِ جہانگیری کے مؤلف کا رُجحان فارسی نویسی کی طرف ہے۔ یہ رجحان کتاب کے آغاز سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔ **مجالسِ جہانگیری** کے مؤلف نے کتاب کے خطبے میں، جو عموماً عربی زبان میں حمد اور نعت پر مشتمل ہوتے ہیں اور اکثر مؤلفین اس میں عربی دعائیں لکھتے ہیں، صرف اللہ کی حمد فارسی زبان میں لکھنا کافی سمجھا ہے اور خود کہتے ہیں کہ انھوں نے رائج انداز میں حمد و ستائش نہیں کی ہے۔ اور جلد ہی کتاب کے اصلی موضوع کی طرف آ گئے ہیں۔ انھوں نے مطالب سادہ زبان میں، سیدھے اور عام قارئین کی سمجھ کے مطابق لکھے ہیں اور ہر طرح کی مبالغہ گویی، عبارت آرائی اور پیچیدہ اور مشکل نثر سے پرہیز کیا ہے۔ مؤلف کی مرصّع اور مصنوع نثر کا واحد نمونہ وہ چند سطریں ہیں جو شاہ عباس صفوی (۹۸۵-۱۰۳۸ھ/۱۵۵۷-۱۶۲۹ء) کے خط کی تمہید کے طور پر شامل کی گئی ہیں۔ شاہ عباس نے مرصّع نثر میں جہانگیر کو ایک خط لکھا تھا

اور مؤلف نے وہ خط اپنی کتاب میں درج کرتے ہوئے چاہا کہ ویسی ہی نثر لکھیں۔ نمونہ یہ ہے:

''آن عریضہ شاہ بجنسہٖ مرقوم می شود تا رشحات سحابِ ربّانی وقطراتِ غمام فضل سبحانی طراوت بخش حدایق ابداع واخترع باشد۔'' (ص ۱۹۵)

مجالسِ جہانگیری کی تألیف جہانگیر کی تائید سے ہوئی ہے۔ وہ اکثر خود اس کی تألیف کے لیے مؤلف کی ہمت افزائی کرتا۔ اگر مؤلف مجلس میں حاضر نہ ہوتے تو انھیں مجلس میں بلوایا جاتا (ص ۲۹)؛ اگر مؤلف کی غیر موجودگی میں مجلس میں کسی اہم بات کا ذکر ہو جاتا تو جہانگیر دربار کے اکابر سے کہتا کہ مؤلف کے لیے دہرا دیں تا کہ ان کی کتاب میں شامل ہو جائے (ص ۱۱۰)۔

مؤلف نے اپنی تحریریں جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا۔ جہانگیر مؤلف کی راہنمائی بھی کرتا کہ کونسی باتیں لکھنی چاہئیں۔ مثلاً ایک دفعہ خان خانان دربار میں آیا تو جہانگیر نے اس پر التفات نہیں کیا۔ عبدالستار سے کہا کہ تم یہ واقعہ قلم بند کرنا (ص ۱۱۴)۔

عبدالستّار ابھی **مجالسِ جہانگیری** کی تألیف کے کام کی ابتدا ہی میں تھے اور سولھویں مجلس لکھ رہے تھے کہ جہانگیر نے اس کی اہمیت کا اندازہ کر لیا تھا۔ ایک دن اس نے مؤلف سے کہا کہ تم جو ہمارے واقعات لکھ رہے ہو، اعتماد الدولہ کے مشورے کے ساتھ، جو واقعات **جہانگیر نامہ** میں شامل کرنے کے لائق ہوں، خان اعظم کو دے دیا کرو اور اگر خان اعظم نے لائق سمجھا تو مابدولت کو بتائے گا تا کہ **جہانگیر نامہ** میں داخل ہو جائیں (ص ۴۳)۔

مؤلف نے منّت مانی تھی کہ **مجالسِ جہانگیری** کو ۴۰ مجالس میں لکھیں گے۔ لیکن بعد میں جہانگیر کی ہمت افزائی اور تائید کی وجہ سے اسے ۱۲۲ مجالس تک پہنچا دیا۔ کتاب ایک سو بائیسویں مجلس پر، معمول کے کسی خاتمے کے بغیر ختم ہو جاتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ مجالس کی تعداد اتنی ہے یا اس کے واحد دستیاب نسخے میں صرف ۱۲۲ مجالس کتابت ہوئی ہیں؟

مؤلف کی منظر نگاری

مؤلف نے کوشش کی ہے کہ واقعات کو جزئیات کے ساتھ لکھیں۔ انھوں نے جہانگیر کی ایک رات کی مجلس کی اس طرح منظر نگاری کی ہے:

''شبہا در صحن خانۂ یک شنبہی، کہ بر پشت بام واقع شدہ، بر تخت دولت جلوس فرمودہ، دیوان خاص می دارند۔ بعضی از نوئینان بزرگ مثل... ووزرا و دیگر متصدّیان مہمّات ملکی و مالی و چندی از پیش خدمتان شاگرد پیشہ و بعضی بہ واسطۂ قدمِ خدمت وعزّت پیری مثل... پی دعا بالا برآمدہ بہ سعادت کورنش مشرّف می شوند و دیگر مردم از علما و فضلا رو بہ روی تخت اقبال بر صفّہ ای کہ بر روی زمین است، قطار در ایستادہ می شوند۔'' (ص ۲۰۳)

ترجمہ: راتوں کو یک شنبہ والے گھر کے صحن میں، جو چھت پر واقع ہے، تخت پر بیٹھتے ہیں اور دیوان خاص لگتا ہے۔ بعض اکابر امرا جیسے... اور وزرا اور ملکی اور مالی امور کے دیگر ذمہ داران، اور چند شاگرد پیشہ نوکر، اور بعض جیسے... اپنی پرانی ملازمت اور بڑھاپے کی عزّت کی خاطر اوپر آتے ہیں اور کورنش بجالاتے ہیں اور دوسرے لوگ،

جیسے علما و فضلا، تخت کے سامنے اس چبوترے پر، جو زمین پر ہے، قطار در قطار کھڑے رہتے ہیں۔

تاریخی، ادبی اور ثقافتی فوائد

مجالس جہانگیری اپنے عہد کے تاریخی، ادبی اور ثقافتی فوائد سے بھرپور ہے۔ ہم صرف چند باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

- مؤلف نے جہانگیر کے چند فارسی اشعار کو شامل کیا ہے جو انھوں نے خود جہانگیر سے سنے تھے (ص۱۰۲-۱۰۳)۔ انصاف کی بات ہے کہ وہ اچھے اشعار ہیں۔ یہ جہانگیر کے اُن اشعار کے علاوہ ہیں جو مختلف مناسبتوں سے کتاب میں جگہ جگہ آئے ہیں۔

-**مجالس جہانگیری** میں چند مقامات پر جہانگیر کے ہم عصر ایرانی صفوی بادشاہوں کا ذکر ہوا ہے۔ شاہ طہماسب اوّل (۹۳۰- ۹۸۴ھ /۱۵۲۴-۱۵۷۶ء) کو متعصّب بادشاہ (ص۱۵) اور شاہ عباس اوّل (۹۸۵-۱۰۳۸ھ/۱۵۸۷-۱۶۲۹ء) کو ظالم، بے رحم اور اَن پڑھ بادشاہ کے طور پر یاد کیا گیا ہے (ص۸، ۵۵، ۱۹۴)۔ جہانگیر نے شاہ عباس کو اپنا ''برادر'' (بھائی) کہا ہے اور توقع کی ہے کہ وہ ایران میں جہانگیر کے سفیر کا خیال رکھے گا (ص۲۰۱)۔ شاہ طہماسب اور شاہ عباس کے بعض کام جہانگیر کی نظر میں غیر معقول اور عجیب تھے۔ جیسے: شاہ طہماسب کا اپنے باپ شاہ اسماعیل (۹۰۷-۹۳۰ھ/۱۵۰۲-۱۵۲۴ء) کے لگائے ہوئے باغ کو اکھاڑ دینا اور خراب کرنا (ص۱۵)؛ شاہ عباس کے تاج کا ٹیڑھا ہونا (ص۲۰۳)؛ شاہ عباس کے نگین کے نقش میں ناقص عبارت کا درج ہونا (ص۱۹۳، ۱۹۴)۔

مجالسِ جہانگیری اور جہانگیر نامہ

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دو ہم عصر کتابوں کے بارے میں، جن کا موضوع ایک ہے اور ایک ہی شخصیت کے بارے میں لکھی گئی ہیں، چند عمومی ملاحظات کا اظہار کیا جائے:

-دونوں کتابوں کے مضامین میں بہت حد تک اشتراک موجود ہے۔ یہ بات **مجالسِ جہانگیری** پر ہماری تعلیقات میں شواہد کے ساتھ ثابت شدہ ہے۔ اکثر واقعات، جو **مجالسِ جہانگیری** کے زمانۂ تألیف (۱۶۰۸- ۱۶۱۱ء) سے متعلق ہیں، **جہانگیر نامہ** میں بھی زیر بحث آئے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ بعض مواقع پر **مجالسِ جہانگیری** کے مؤلف نے کسی بات کی بہت اہمیت جتائی ہے، لیکن **جہانگیر نامہ** میں اسے سرسری بیان کیا گیا ہے، کبھی اس کے اُلٹ عمل ہوا ہے۔ البتہ یہ دونوں مؤلفین کے سلیقے، ذوق اور ترجیحات کا معاملہ ہے۔ **جہانگیر نامہ** میں بعض واقعات اصلاح ہو کر اور ذرا خوبصورت انداز میں درج ہوئے ہیں۔ **مجالسِ جہانگیری** کی تألیف کے بعد بھی جہانگیر کے جو حالات و واقعات **جہانگیر نامہ** میں آئے ہیں، ان سے جہانگیر کی مجموعی شخصیت کی وہی تصویر بنتی ہے جو **مجالسِ جہانگیری** کی روشنی میں بنتی ہے۔ اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ (۳۸)

بعض مطالب کے بیان میں دونوں کتابوں میں معمولی اختلافات موجود ہیں۔ مثلاً:

الف: شاہ عباس کے خط کے جواب میں ایک شعر شامل کرنے کے معاملے میں، **مجالسِ جہانگیری** سے یہ تاثر ملتا ہے کہ

جہانگیر بہت بے چین تھا، لیکن **جہانگیر نامہ** میں اس موضوع میں جہانگیر کی بے چینی کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ہوا ہے۔ شاید جہانگیر نہیں چاہتا تھا کہ اپنے دربار کی سرکاری تاریخ میں اس بے چینی کا ذکر وارد ہو۔

ب: **مجالسِ جہانگیری** میں کئی جگہوں پر پادریوں کے ساتھ ہونے والے دینی مناظروں اور مباحثوں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن **جہانگیر نامہ** میں اس موضوع کا فقدان ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہوسکتی ہے کہ **مجالس جہانگیری** کے مؤلف خود اس موضوع سے خاص دلچسپی رکھتے تھے اور ان کے لیے اس موضوع کا بیان بہت اہم تھا۔

ج: **مجالسِ جہانگیری** میں مؤلف نے چند جگہوں پر لکھا ہے کہ جہانگیر سزا کے طور پر مجرموں کے ہاتھ، پاؤں کاٹنے پر یقین نہیں رکھتا تھا اور اس فعل کو خدا کی مخلوق کو ناقص کرنے کے مترادف سمجھتا تھا، لہٰذا جہانگیر نے اس سزا کے خلاف قوانین جاری کیے۔ لیکن اس قانون میں استثناء بھی تھا۔ مثلاً جہانگیر نے اکبر کی اور اپنی تصویر کشی کے لیے صرف تین درباری مصوّر مقرر کیے اور حکم تھا کہ اگر ان کے علاوہ کوئی اکبر یا اس کی تصویر بنائے گا تو اس کے ہاتھ کی انگلی کاٹ دی جائے گی! (ص۲۴۲-۲۴۳)

جہانگیر نامہ میں بھی چند جگہوں پر شواہد ملتے ہیں کہ جہانگیر نہ صرف معمولی جرم پر جسمانی اعضا کاٹنے کا حکم دیتا تھا بلکہ پھانسی کا حکم بھی صادر کرتا تھا۔ (۳۹)

د: **مجالس جہانگیری** کی روشنی میں نظیری نیشاپوری کی جو تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ بالکل جاذبِ نظر نہیں ہے۔ جب کہ **جہانگیر نامہ** سے اس کا بہت بہتر تاثر جھلکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا سبب **مجالسِ جہانگیری** کے مؤلف کی اپنی منفی سوچ ہو۔

ھ: **جہانگیر نامہ** واقعات کی سرکاری اور منظور شدہ تاریخ ہے۔ اسی وجہ سے اس کی عبارت اور مطالب کے پیش کرنے کی طریقے میں تکلّف اور بناوٹ نظر آتی ہے۔ جب کہ **مجالسِ جہانگیری** میں واقعات زیادہ تر ذاتی اور بے تکلّفانہ انداز میں بیان ہوئے ہیں۔

مجالسِ جہانگیری کا مخطوطہ

مجالسِ جہانگیری کا واحد مخطوطہ، جس کی بنیاد پر ہم نے اسے شایع کیا ہے، لاہور میں اردو کے محقق اور علم دوست، خلیل الرحمان داؤدی (م: ۱۱ ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ/ ۲۶ جنوری ۲۰۰۲ء) کے پاس تھا۔ اس نسخے پر بہاول پور (پنجاب، پاکستان) کے ایک کتب فروش کی مہر لگی ہوئی ہے گویا یہ نسخہ وہاں سے آیا ہے یا کسی زمانے میں اس کتب فروش کے پاس تھا۔ داؤدی صاحب کی وفات کے بعد یہ نسخہ اب ان کے فرزند شقایق النعمان داودی صاحب کی تحویل میں ہے۔ نسخۂ داؤدی میں ترقیمہ اور تاریخ کتابت نہیں ہے۔ یہ قیاساً بارہویں صدی ہجری میں ہندی طرز کے خطِ نستعلیق میں کتابت کیا گیا ہے۔ اس کے کل ایک سو ستانوے (۱۹۷) اوراق ہیں اور ہر صفحے میں پندرہ سطور ہیں۔ سرورق پر ایک مہر لگی ہوئی ہے جو بالکل پڑھی نہیں جاتی۔ کاتب کا ایک خاص طریقۂ املاء ہے، کسرہ (ـِ) کی بجائے ''ی'' سے استفادہ کیا گیا ہے۔ بعض اوقات الفاظ کو مقامی تلفظ کے ساتھ درج کیا گیا ہے جو تورانی فارسی کے زیر اثر ہے؛ جیسے: خذمت (ورق ۳۱b، ۷۸b)، گنبذ

(ورق ۸b، ۱۲a)، فرود کو فروز (فروذ؟) لکھا ہے (ورق ۱۸۴a)۔

کاتب سے مجالس کے انعقاد کی تاریخیں درج کرنے میں بعض اوقات غلطی ہوئی ہے اور بعض تاریخوں کو آگے پیچھے لکھا ہے (مثلاً: مجلس ۹۲: ۲۹ ربیع الاوّل ۱۰۲۰ھ کو، مجلس ۹۳: ۲ ربیع الاوّل ۱۰۲۰ھ کو اور مجلس ۹۴: ۲۴ ربیع الاوّل ۱۰۲۰ھ کو) ایک سونویں (۱۰۹) مجلس بے ربط جملوں پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد مجلس ۱۱۹ شروع ہوتی ہے۔ مجلس ۱۰۹ کے اختتام پر عبارت کا بے ربط ہونا واضح ہے:

> ''فرمودند کہ حسن مطلع را بسیار خوب گفتہ است (یہاں سے آگے بے ربط عبارت ہے) وگذشت و بعد توجہ گرامی لختی بہ دیدن وخریدن آن مصروف گردید و امالۂ دلہا فرمودہ جمعی کثیر را از غریبان کامروا گردانیدند۔''
>
> (و ۱۹۲b مخطوطہ مطابق ص ۲۷۰ مطبوعہ)

معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے مجلس ۱۰۹ کے اختتامی جملوں کو مجلس ۱۱۸ یا کسی اور مجلس کے جملوں کے ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ ان شواہد کی روشنی میں نسخۂ داؤدی میں مجلس ۱۱۰ تا ۱۱۸ موجود نہیں ہیں۔

مجالسِ جہانگیری کے نسخۂ داؤدی کے علاوہ کوئی دوسرا نسخہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔ (۴۰)

۳۔ مجالس جہانگیری کی روشنی میں جہانگیر کی تصویر اور شخصیت

محمد سلیم، جلال الدین اکبر کا بڑا بیٹا تھا۔ اس کی ماں راجہ بہاری مل کی بیٹی تھی۔ وہ بدھ کے روز، ۱۷ ربیع الاوّل ۹۷۷ھ / ۳۱ اگست ۱۵۶۹ء کو فتح پور سیکری میں پیدا ہوا اور جمعرات، ۲۰ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ / ۲۴ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو ۳۸ سال کی عمر میں اکبر کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا اور اپنے لیے ''ابوالمظفر نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ'' کا لقب منتخب کیا۔ ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء میں غیاث بیگ ایرانی مخاطب بہ ''اعتمادالدولہ'' کی بیٹی مہر النساء سے شادی کی جس کے القاب ''نور محل'' اور ''نور جہاں'' تھے۔ ہندوستان پر ۲۳ سال بادشاہت کے بعد جہانگیر ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ / ۷ نومبر ۱۶۲۷ء کو کشمیر کے راستے میں انتقال کر گیا اور لاہور کے قریب شاہدرہ میں دریائے راوی کے کنارے دفن ہوا۔ اس کے بیٹے اور جانشین شاہجہان نے اس کی قبر پر ایک پرشکوہ مقبرہ تعمیر کیا، جو ابھی تک موجود ہے۔ جہانگیر کے مقبرے کے مغرب میں ایک کلومیٹر کے فاصلے پر اس کی چہیتی ملکہ، نور جہاں کا مقبرہ بھی ایک الگ احاطے میں موجود ہے۔

یہاں جہانگیر کی وہ تصویر دکھانا مقصود ہے جس کا خاکہ عبدالستّار نے **مجالس جہانگیری** میں کھینچا ہے۔ محترم قارئین کے ذہن میں یہ بات رہے کہ **مجالس جہانگیری** میں جہانگیر کی حکومت کے صرف پہلے تین سالوں یعنی تخت نشینی کے چوتھے سے چھٹے سال تک (۲۴ رجب ۱۰۱۷ - ۱۹ رمضان ۱۰۲۰ھ / ۲۴ اکتوبر ۱۶۰۸ - ۱۵ نومبر ۱۶۱۱ء) کی روداد بیان کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ ہمارے تجزیے کا محور مذکورہ تین سال کے واقعات ہی ہیں۔ جہانگیر کی سیرت، فطرت اور طرزِ حکومت کی تصویر **جہانگیر نامہ، اقبال نامۂ جہانگیر** اور **مآثر جہانگیری** جیسی مستند ہم عصر کتابوں یا اس کے بیٹے اور جانشین شاہ جہان کے دَور میں

لکھی جانے والی تاریخوں **پادشاہ نامہ** از عبدالحمید لاہوری اور **عمل صالح** از محمد صالح کنبولا ہوری کو سامنے رکھ کر مکمل کی جاسکتی ہے۔

- مؤلف نے دیباچے میں جہانگیر کو ''عاجز نواز، غریب پرور، ظالم گداز، عدالت گستر'' جیسے القاب سے یاد کیا ہے اور اس کے ذوقِ خدا پرستی اور کثرت مشاغل مملکت کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے (ص۲) جو براعتِ استہلال کا نمونہ ہے، کیونکہ جو واقعات کتاب میں بیان ہوئے ہیں وہ جہانگیر کی ان دو خصوصیات پر سچے گواہ ہیں۔

- جہانگیر فرنگ اور عیسائیت کے بارے میں معلومات جمع کرنے سے دلچسپی رکھتا تھا اور اس کی محفل میں ان موضوعات پر بار بار توجہ دی جاتی تھی (ص۳، ۲۹)۔ (۴۱)

- اس کی حکومت کا اصول ''صلح کل'' تھا۔ وہ رعیت کے تمام طبقات اور تمام فرقوں اور مذاہب کے ساتھ انصاف اور مساوات ملحوظ رکھتا تھا (ص۳، ۳۴، ۷۸، ۲۰۱)؛ تعصب کو پسند نہیں کرتا تھا (ص۷۸، ۲۰۱) اور نسلی، گروہی، مذہبی اور علاقائی تعصّبات سے شدید نفرت کرتا تھا (۵)۔

- اس کے دربار میں ہر دین اور مذہب کے اہلِ دانش ہمیشہ حاضر رہتے تھے اور وہ مختلف مناسبتوں سے ان سے زیر بحث مسائل کے بارے میں دینی احکام پوچھتا تھا۔ آراء کا ردّ و قبول ہوتا رہتا تھا۔ مثلاً ۱۴ شوال ۱۰۱۸ھ/۳۱ دسمبر ۱۶۰۹ء کی رات کو غیر معمولی چاند گرہن ہوا تو مجلس میں موجود مسلمان، عیسائی اور ہندو دانش وروں نے اس کے بارے میں علم ریاضی اور علم نجوم کی رو سے اظہار رائے کیا (ص۱۳)۔

- جہانگیر بھی اکبر کی طرح مسیحی عقائد جاننے میں دلچسپی رکھتا تھا اور اس کے دربار میں ہمیشہ فرنگی پادری اور دانا موجود رہتے۔ وہ پادریوں کو مجلس میں طلب کر کے سوالات کرتا رہتا تھا (ص۳، ۴، ۸۶، ۱۱۶)۔ ایک دفعہ اس نے پادریوں کے ساتھ بحث میں ان کے باطل عقائد اور اسلام کی حقانیت کے بارے میں دلائل دیے (ص۴، ۳۶-۳۷، ۷۶)۔

- ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۱ء میں عید قربان کے روز اونٹ اور بھیڑیں قربانی کے لیے جہانگیر کے سامنے لائے گئے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے تین بھیڑیں ذبح کیں (ص۱۶۰)۔

- وہ شانِ رسالت نبی کریمؐ کا ادب و احترام سے قائل تھا اور اس سلسلے میں تیسرے خلیفہ کے ایک عمل کو خلافِ ادب جانتا تھا۔ (ص۹۹)

- اس کے دربار میں حنفی اور شافعی علماء موجود رہتے تھے (ص۲۶۶)۔

- وہ سنّی عقیدے کا پابند تھا (ص۵۴)؛ شیعہ عالم قاضی نور اللہ شوشتری کی گرفتاری کے معاملے میں جہانگیر کی رائے یہ تھی کہ قاضی صاحب اپنے اعمال کے نتیجہ میں گرفتار ہوئے اور عوام کو چاہیے کہ وہ بادشاہ کو متعصب سنّی تصور نہ کریں (ص۷۸)۔

- وہ روافض کو پسند نہیں کرتا تھا (ص۱۷، مطبوعہ متن میں لفظ ''رافضی'' ایرانی ناشر کی طرف سے محذوف ہے)۔

- اس نے پندرہ شعبان کی رات (شب برات) کو چراغاں کا حکم دیا (ص۱۰۶)۔

- اس نے اپنے مقرّب امیر نقیب خان کے محبوب بیٹے عبداللطیف کو الحاد کے جرم میں قیدخانے بھیج دیا (ص۲۲)۔

- وہ درویشوں اور جوگیوں سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ ان سے ملتا تھا اور ان کے بڑھاپے کی وجہ سے احترام کرتا۔ چشتیہ سلسلے کے مشائخ سے خاص عقیدت رکھتا۔ مشائخ کے حالات وحکایات سنتا اور ان کے تئیں عملی عقیدت کا مظاہرہ کرتا (ص۷، ۱۶، ۱۹-۲۰، ۲۷، ۴۷-۴۸، ۲۲۷)؛ اس کی مجالس میں تکرار کے ساتھ چشتیہ مشائخ کا ذکر ہوتا تھا (ص۱۳۴، ۱۳۷، ۱۸۴)؛ خواجہ معین الدین چشتی سے خاص عقیدت رکھتا تھا کیونکہ اس کا باپ اکبر، حضرت خواجہ کے مزار پر جا کر بیٹے کی مراد مانگتا تھا۔ بعد میں خدا نے اسے جہانگیر عطا کیا۔ جہانگیر اکثر وبیشتر حضرت خواجہ کی روح کو ایصال ثواب کے لیے منّت مانتا اور اپنے شکار کیے ہوئے گوشت کو حضرت خواجہ کے نام پر پکاتا اور مستحقین اور درویشوں کو کھلاتا۔ ایک رات اس نے ایک سو اسّی افراد کو کھانا کھلایا۔ مزید بخشش بھی کی اور فرداً فرداً ہر ایک سے اس کے حالات بھی پوچھے (ص۱۶۰، ۱۶۲-۱۶۵)۔

- وہ قحط الرجال سے شاکی تھا اور کہتا تھا: افسوس کہ ہمارے زمانے میں کوئی ایسا خدا پرست نہیں ہے جس پر حق شناسی اور اسرار حق جاننے کا گمان کیا جا سکتا ہو (ص۲۷)۔

- وہ رات کو تسبیح کیا کرتا تھا (ص۷۹، ۱۲۱، ۱۸۲، ۲۴۱، ۲۵۵، ۲۶۱)۔

- جہانگیر کا شعر کہنے، شعر سننے، موسیقی اور تصویر کشی کا ادبی اور فنّی ذوق نہایت پختہ تھا۔ اس نے خود اکبر کے زمانے کے شعراء کے حالات پر ایک تذکرہ لکھا تھا جو بعد میں ملاّ مطربی سمرقندی کو دے دیا تا کہ تذکرۂ **نسخۂ زیبائے جہانگیر** میں شامل کر لے۔ (۳۹)

جہانگیر کا شبانہ دربار، ادبی محفلوں میں تبدیل ہو جاتا۔ وہ نکتہ آفرینی، ادبی لطائف اور اچھے مزاح کی تعریف کرتا تھا (ص۶۸-۶۹)۔ وہ خود بھی بہت اچھا نکتہ آفرین تھا۔ اس کی طبیعت میں لطافت تھی۔ **مجالس جہانگیری** ایسی معلومات کا بہترین اور بھرپور مأخذ ہے۔ بعض باتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

- مولانا تقیا شوشتری نے شیخ رجب شیرازی کا ایک شعر پڑھا:

برسر تربت من چتر سیاہی بزنید
تا بدانند ہمہ خلق کہ تن کشتۂ اوست

جہانگیر نے کہا: اگر یہ غزل کا شعر نہ ہوتا تو ''اوست'' کی بجائے ''کیست'' پڑھنا زیادہ فصیح تھا (ص۷)۔

- جہانگیر برمحل اشعار پڑھتا تھا (ص۲۳، ۲۴)۔ اگر مجلس میں کسی شعر کا ایک مصرع یا کسی رُباعی کا ایک شعر پڑھا جاتا تو خود پورا شعر پڑھ دیتا (ص۱۸۲-۱۸۳)۔ جب کبھی نئے یا اچھے اشعار اس کی سماعت تک پہنچتے تو ان کی تکرار کرتا (ص۴۰-۴۱، ۱۷۳، ۲۴۹، ۲۵۱، ۲۶۹)۔

- مولانا تقیا شوشتری اور مولانا روزبہ شیرازی نے جہانگیر کے حوض کے لیے تاریخی قطعات کہے تھے اور ان کے

مادّے یہ تھے: ''حوضِ پاکیزہ سنگِ زیبا'' (تقیا) اور ''آب زندگی بردار از حوضِ جہانگیر'' (روزبہ)، جہانگیر نے ان دونوں پر شدید تنقید کی۔ اس نے تقیا سے کہا: دانش، فہم کی درستی، شعرگوئی اور شعرفہمی کے دعوے کے باوجود، تمھیں کیا ہوا کہ اتنا خراب شعر کہو؟ (ص۳۸)۔ روزبہ کے قطعے کے بارے میں کہا: مولانا روزبہ نے نافہمی کی قباحت کا کیسا مظاہرہ کیا جو ایسی بات کہی۔ اسے یوں کہنا چاہیے تھا: ''حوضِ جہانگیر سے آبِ حیات لو یا پیو، نہ کہ آبِ حیات نکالو۔ اُسے نہیں معلوم کہ یہ بدشگونی ہے! (ص۳۹)۔

- جہانگیر ہجوگویی کو بالکل بھی پسند نہیں کرتا تھا اور ہجوگوشعراء کی اس کے دربار میں کوئی جگہ نہ تھی اور کہتا تھا ہمیں بے باک، فضول گوشعرا پسند نہیں ہیں (ص۳۹-۴۰، ۱۶۶)۔ وہ قصیدہ بھی چنداں پسند نہیں کرتا تھا (ص۱۵۳، ۱۹۸)۔ قصیدے کی ناپسندیدگی کی وجہ وہ یہ بیان کرتا: ''قصیدہ گوشاعروں کے ہاں مدح کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ''کیخسرو تمہارا غلام، سکندر تمہارا دربان، دارا تمہارا ادنیٰ نوکر، نوشیروان تمہاری عدل کی بساط کا جاروب کش وغیرہ۔ اس طرح کی باتیں ہماری راستی اور انصاف پسند طبیعت پر گراں گذرتی ہیں۔ خدا نے جن لوگوں کا بڑا مرتبہ دیا ہے آخر انھیں کیوں چھوٹا بنا کر پیش کیا جائے؟ ہاں اگر شاعر کے ممدوح کی بزرگی (شان) اور کمالات، سابقہ لوگوں کی شان کے مرتبے سے بڑھ کر ہیں تو گنجایش نکل آتی ہے، حالانکہ یہ بھی کوئی خوش آیند بات نہیں ہے (ص۱۹۹)۔

- جہانگیر جو اشعار خود کہتا اور محفل میں پڑھتا، ان کے لیے تکلّف اور خوشامد پر مبنی تعریف اور تحسین سننا نہیں چاہتا تھا (ص۹)۔

- جہانگیر نے اصنافِ سخن کے بارے میں اپنی پسند اور ناپسند وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے۔ کہتا ہے: ''بہترین اصنافِ سخن غزل اور رباعی ہیں۔ ہم قصیدہ کے قائل نہیں ہیں کیوں کہ شاعر مدح گوئی میں حدّ سے گذر جاتے ہیں'' (ص۲۶۹)۔

- جہانگیر شعرشناس تھا۔ سلطان علاءالدین [خلجی] کو سعدی کے ایک شعر پر وجد طاری ہو گیا تھا۔ خانِ اعظم نے یہ واقعہ جہانگیر کے سامنے بیان کیا اور کہا کہ اسے وہ شعر اب یاد نہیں ہے جس پر وجد ہوا تھا۔ جہانگیر نے اس سے کہا کہ اگر وہ سعدی کی مکمّل غزل پڑھے تو وہ متعلقہ شعر کی نشاندہی کر دے گا۔ خان اعظم نے غزل پڑھی اور جہانگیر نے وہ شعر بتا دیا (ص۱۳۵)۔

- ملک قمی کے **ساقی نامہ** کے بارے میں کہا کہ بہت خوب ہے اور درویشانہ کہا ہے (ص۴۰، ۴۱)۔

- شکیبی اصفہانی، جہانگیر کی خدمت میں پہنچا تھا۔ ابھی دو روز نہیں ہوئے تھے کہ واپس ایران جانے کی رخصت چاہی۔ جہانگیر نے اس کے تخلّص کی رعایت سے نکتہ آفرینی کی اور کہا: ''ملاشکیبی بایستی کہ روز [ی] چند بہ مقتضای تخلّص خویش ''می شکیبید''، عجب کہ ''شکیب'' را کار نافرمودہ، از ماز ود کبیدید'' اور دوبارہ اس سے کہا: ''شکیب فارسیِ صبر است شکیبی یعنی صبری و عاشقان را صبر نمی باشد۔ پس ''بی صبری''، تخلّص کردن بہ حال شاعر لایق تر می نماید'' (ص۴۹)

- شکیبی نے جہانگیر کے ذاتی خنجر پر نقش کرنے کے لیے ایک رباعی پڑھی تھی:

سوزندہ کٹارہ ای کہ کوہش کاہ است
از شاہ جہانگیر ابن اکبر شاہ است

جہانگیر نے کہا: ''خنجر کو گھاس سے کیا نسبت؟ اور دوسرا مصرع لفظ ''ابن'' سے بگڑ گیا ہے۔'' (ص ۶۰)

- طالب اصفہانی کی ایک رُباعی ایسی تھی جس کا تیسرا مصرع ''اورفت و بہ دنبالۂ او عمر برفت'' تھا۔ اکبر نے اس میں یوں تصرّف کیا تھا: ''اورفت، زر فتنش مرا عمر برفت۔'' جہانگیر نے بھی رائے دی اور کہا: لفظ ''دنبالہ'' بہت گراں اور بے تکا ہے۔ کسی بزرگ نے کہا ہے:

بنشینم وصبر پیش گیرم
دنبالۂ کار خویش گیرم

لفظ ''دنبالہ'' چونکہ گراں تھا، اس لیے مابدولت نے اس طرح فرمایا ہے:

بنشینم ودل نہم بہ دوری
در جان زنم آتشِ صبوری (ص ۴۹-۵۰)

- جہانگیر، طالب اصفہانی کی شاعری کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتا تھا اور کہا کہ طالب کے بہت اچھے اشعار ہیں (ص ۶۳)۔

- کیفی گپی نے جہانگیر کی خدمت میں ایک قصیدہ پڑھا جس کا آخری مصرع یہ تھا:

الٰہی تا کہ خاک و باد و آتش را بقا باشد

جہانگیر نے کہا: پانی نے کیا گناہ کیا ہے کہ پانی کو نہیں لائے ہو؟ مصرع ناقص رہ گیا ہے (ص ۱۶۶)۔

- جہانگیر محاورے اور زبان کی درستی کے بارے میں بہت حسّاس تھا۔ ایک دفعہ خان اعظم نے ایک ترکی شعر پڑھا جس کا مضمون یہ تھا ''چشمت چہ بلا سیاہ شدہ برای جان من!'' جہانگیر نے کہا ''چشم بہ خون من سرخ شدہ'' محاورہ ہے (ص ۶۸-۶۹)۔

- کبھی امتحان یا مقابلے کے لیے شعرا کو کسی شعر یا غزل کی تقلید یا جواب کہنے کی تجویز دیتا اور بعد میں اس کا تنقیدی جائزہ لیتا۔ شاہ عباس صفوی نے ایک خط میں جہانگیر کو مخاطب کرتے ہوئے ملاّ محمد امین ذوقی کی غزل کا ایک شعر لکھا تھا:

ہمنشینم بہ خیال تو و آسودہ دلم
کاین وصالی است کہ در پی غم ہجرانش نیست

اس شعر نے جہانگیر کو بہت متاثر کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جواب میں لکھے جانے والے خط میں ایسا شعر درج ہو جو اس کے خط کا مکمّل مضمون بیان کر دے۔ اس نے اُن دنوں دربار میں موجود شعرا کو ایسا شعر کہنے کا حکم دیا۔ اس خیال نے بادشاہ کو چند شب و روز تک بے چین اور پریشان رکھا اور کئی راتوں تک یہ مسئلہ گفتگو کا موضوع رہا ہے (دیکھیے: مجالس ۸۰،

۸۱، ۸۳، ۹۰، ۹۱، ۹۴)۔ جو اشعار ملّا شکیبی اصفہانی، نظیری نیشاپوری، سعید اگیلانی اور حیاتی گیلانی جیسے معروف شعرا نے اس کے جواب میں کہے تھے، ان میں سے ایک بھی جہانگیر کو معقول نہیں لگا اور پسند نہیں آیا۔ وہ جس شعر کو ردّ کرتا اس کی دلیل بھی شعرا کے سامنے بیان کرتا، جس سے واقعی اس کی طبیعت میں عمدہ شعری ذوق اور تنقیدی جوہر کھل کر سامنے آتا ہے۔ آخر کار ایک گمنام شاعر شیخ جمیلی کا، جو شیخ جلال واصل کا بیٹا تھا، شعر جہانگیر کو پسند آ گیا (ص ۲۳۲-۲۳۳)۔

- امیر خسرو دہلوی کی ایک غزل کی ردیف ''سفید و سیاہ و سرخ'' تھی۔ جہانگیر نے پہلے اس شعر کی نزاکت اور خسرو کی غزل کی خوبیاں بیان کیں اور اس کے بعد شعرا سے کہا کہ اس کے جواب میں غزل کہیں۔ نظیری نیشاپوری اور شیخ جمیلی نے غزلیں کہیں جن میں سے کوئی بھی جہانگیر کو پسند نہیں آئی اور اس نے ان پر تنقید کی (ص ۱۵۵-۱۵۶، ۲۲۸)۔

شعرا، دانشوروں اور اہلِ ہنر کے ساتھ روّیہ

- یہ طے تھا کہ جو ایرانی، تورانی مشرقی، مغربی، تاجر، سپاہی، درویش، دولت مند، حکیم، ملّا، دستکار اور صنعت گر اپنے پیشے میں ماہر دارالحکومت آگرہ میں آتا اسے جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا جاتا اور وہ ہر ایک کو فن اور ہنر کے معیار کے مطابق داد و دہش کرتا (ص ۱۰۸، ۲۳۴، ۲۶۳)۔

- جہانگیر ہنر مندوں کی تعریف یا تنقید کرنے، ان پر التفات کرنے اور ان کے مرتبہ کا لحاظ رکھنے میں کوئی امتیاز نہیں برتتا تھا (ص ۲۰۵) یعنی جو جس چیز کا مستحق ہوتا، جہانگیر اس کے ساتھ ویسے ہی پیش آتا۔

- جہانگیر نے ایک دفعہ حاضرین سے پوچھا کہ لوگ شیخ سعدی کو زیادہ بڑا سمجھتے ہیں یا خواجہ حافظ کو؟ البتہ اس کا سوال ان دونوں شعرا کی خدا پرستی اور درویشی کے مقام و مرتبے کے بارے میں تھا، نہ کہ شاعری کے لحاظ سے۔ جہانگیر شیخ سعدی کے شعری رتبے کو زیادہ بلند سمجھتا تھا، خاص طور پر غزل میں (ص ۲۵۶)۔

- جہانگیر نے ایک مجلس میں ملّا شکیبی اور نظیری کی فضیلتوں کے بارے میں سوال کیا اور دونوں شعرا سے ان کے دیوان کی تدوین کے بارے میں پوچھا۔ اسی مجلس میں جہانگیر نے دو شاعروں -نوعی اور کفری- کو بھی یاد کیا، جنھوں نے اپنی جان جہانگیر پر قربان کر دی تھی (ص ۱۸۹-۱۹۰)۔

- جہانگیر نے ۷ شعبان ۱۰۱۹ھ/ ۱۵ اکتوبر ۱۶۱۰ء کو حیاتی گیلانی کو امیر خسرو کا **تغلق نامہ** مکمل کرنے پر روپوں میں تولا۔ اس کا وزن سات ہزار اور چند ''جہانگیری'' سکّے بنا۔ دربار کی روایت کے مطابق یہ رقم اسے دی گئی (ص ۱۰۸-۱۰۹)۔

- حیاتی سے ایک دفعہ کوئی غلطی ہو گئی۔ جہانگیر نے اسے معاف کر دیا۔ اس کے بعد حیاتی نے غزل کہی اور خدمت میں پیش کی۔ جہانگیر نے اس کے دو تین اشعار کو پسند کیا اور دوبارہ سنے تو وہاں موجود دوسرے شعرا کو اس پر رشک ہوا (ص ۲۲۳، ۲۲۸)۔

- اسی مجلس میں جب حیاتی نے ایک غزل سنائی تو جہانگیر نے ان الفاظ سے اسے دادِ سخن دی: ''سبحان اللہ! دوسرے جوانوں سے اچھی کہی ہے''۔ اور پھر کہا: ہم نے ان بوڑھے شعرا کو ''جوانوں'' سے تعبیر کیا ہے، تاکہ ''بوڑھا'' کہنے سے ان کا دل بُرا نہ ہو (ص ۲۲۸-۲۲۹)۔

- جہانگیر نے مجلس میں شیخ جمیلی سے وہ غزل سنی جسے کہنے کے لیے حکم دیا گیا تھا اور اسے پسند کیا اور دوبارہ سنا اور اس غزل کا ایک شعر شاہ عباس صفوی کے خط کے لیے موزوں قرار دیا۔ جہانگیر نے وہ کاغذ جس پر شیخ جمیلی نے اپنی غزل لکھی تھی، اس سے لے لیا اور اپنے لباسِ شاہی کے بند میں رکھ لیا اور حکم دیا کہ جو کچھ شاعر کو دن کے وقت خدمت میں حاضر ہونے پر دیا گیا تھا، آج رات اس کا دوگنا دیا جائے۔ حاضرین میں سے ایک نے عرض کیا: اس سے بڑا صلہ کیا ہوگا کہ حضرت نے اس کا شعر اپنے لباس کے بند میں رکھ لیا ہے۔ جہانگیر نے شیخ جمیلی کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا: ''ما شمارا در بندِ خود بستیم۔'' - ہم نے تمھیں اپنے بند میں باندھ لیا - اس نے عرض کیا: ''من از دیر در بندِ پادشاہم'' - میں پہلے ہی بادشاہ کے بند میں بندھا ہوں - جہانگیر نے کہا: بارک اللہ! تم نے خوب جواب دیا (ص ۲۳۲-۲۳۳)۔

- نظیری نیشاپوری، جو پہلے خان خانان کی ملازمت میں تھا، جہانگیر نے اسے گجرات سے دارالحکومت (آگرہ) بلایا اور اس کی خوش اطواری، مہمان دوستی اور مہمان نوازی کی تعریف کی۔ اس کے بعد دلجوئی کے لیے اس کا ۱۴۰ اشعار پر مشتمل طویل قصیدہ بڑے حوصلے کے ساتھ سنا اور ایک ہزار روپے اور گھوڑا اور خلعت عطا کیے اور وطن واپس جانے کی اجازت دی (ص ۱۵۳-۱۵۴)۔

- جو غزل نظیری نے جہانگیر کی فرمائش پر شاہ عباس کے خط کے جواب کے لیے کہی تھی، اس نے جہانگیر کا دل نہیں جیتا اور جہانگیر نے صرف ایک دو شعروں کی تعریف کی۔ نظیری کا اصرار تھا کہ اور بھی تین چار اچھے اشعار ضرور ہیں۔ یہ اصرار بے جا اور خلاف ادب تھا، لیکن جہانگیر نے باقی اشعار بھی تحمل اور بردباری سے سنے (ص ۲۰۴-۲۰۵)۔

- جہانگیر نے ۱۹ صفر ۱۰۲۰ھ / ۲۴ اپریل ۱۶۱۱ء کو احمد آباد کا مشہور ترین باغ ''رستم باڑی'' نظیری کو دے دیا (ص ۲۱۹)۔

- ایک غزل کے مقطع کے صلے میں، جو نظیری نے دربار میں پڑھی تھی، جہانگیر نے احمد آباد میں ''شاہ باڑی'' نامی ایک بڑا باغ جو مرحوم شہزادہ سلطان مراد نے بنوایا تھا، نظیری کو انعام میں دے کر اس کی پوری ملکیت میں دے دیا۔ جہانگیر نے اس کے لیے ''بینظیر باڑی'' کا نام تجویز کیا۔ پھر اسے ہاتھی بھی عنایت ہوا (ص ۲۲۴)۔

- جہانگیر نے شیخ جمیلی سے ایک غزل سنی اور اسے مزید اشعار کہنے کا کہا۔ جمیلی کے پڑھے گئے ایک مصرع کے جواب میں جہانگیر نے فی البدیہہ ایک شعر کہا (ص ۲۲۴-۲۲۵)۔

- شیخ جمیلی سے فرمائش کر کے رام نوتہ کا قصّہ سنا اور اسے شال اور نقد انعام دیا۔ جمیلی نے امیر خسرو کی غزل کی تقلید میں ایک غزل کہی تھی۔ جہانگیر نے وہ غزل حاضرین کو بھی سنوائی (ص ۲۲۶-۲۲۷)۔

- حکیم حمید احمد آبادی کو شرافتِ نفس، ہاتھ کی برکت، قدیم الخدمت اور بزرگی کی وجہ سے اتنا انعام واکرام دیا کہ حاضرین کو حیرت ہوئی۔ جہانگیر نے حاضرین کے سامنے اس کی یوں وجہ بیان کی: ''ہماری توجہ حکیم کی نیک نفسی اور فلاح عامہ پر ہے، احمد آباد کے درماندوں اور خلق خدا کے ساتھ اس کی بھلائی کو مدّنظر رکھیں، کیوں کہ اس اکیلے نے وہاں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔'' (ص ۱۵۷)

-حکیم ابوالفتح کے فرزند حکیم فتح اللہ کو امانت داری اور نیک سیرتی کی وجہ سے خلقِ خدا کی فلاح کے لیے کھنبایت بھیجا اور ایک عراقی گھوڑا، بڑی بگھی اور شال دے کر رخصت کیا اور منصب و تنخواہ میں اضافے کا شاہی وعدہ بھی کیا۔ حکیم موصوف ایک دفعہ قید ہو گئے تھے۔ جہانگیر نے کسی کی سفارش کے بغیر محض اس کی قابلیت کی بنا پر اسے آزاد کیا (ص ۲۷۱-۲۷۲)۔

خطاطی، مصوّری، کندہ کاری اور سکّے ڈھالنے سے دلچسپی

- جہانگیر نے اپنے لیے ایک خاص مرقّع [البم] تیار کیا ہوا تھا (۴۳) اور اس کی جلد کے لیے یہ شعر خود ہی کہا تھا:

این مرقّع شدہ زلطف الہ
از جہانگیر شاہِ اکبر شاہ

- جہانگیر نے حیاتی گیلانی سے بھی کہا کہ مرقّع کے لیے ایک مطلع کہے (ص ۴۸)۔ جہانگیر نے شکیبی اصفہانی کی ایک رباعی پسند کی اور اپنے قلم سے مرقّع میں لکھا (ص ۵۱)۔

- جو مجالس ماہ ربیع الاوّل ۱۰۱۹ھ / مئی ۱۶۱۰ء میں منعقد ہوئیں، ہر مجلس کے آخر میں مرقّع میں سے کچھ تصویریں جہانگیر کو دکھائی جاتیں اور خط کی نزاکتوں، مصوّری کے کمالات اور ایران، توران، فرنگستان، روم اور ہندوستان کے اساتذۂ فن کی نادرہ کاریوں کا ذکر محفل میں ہوتا تھا (ص ۵۳)۔

- جہانگیر بادشاہوں اور اپنے آبا و اجداد کی تصویر کشی میں بہت احتیاط اور باریک بینی سے کام لیتا تھا۔ دربار کے صرف تین مصوّروں کو اجازت تھی کہ تصویر کشی کیا کریں۔ حکم یہ تھا کہ اگر ان کے علاوہ کوئی اور اکبر یا جہانگیر کی شبیہ بنائے گا تو اس کے ہاتھ کی انگلی کاٹ دی جائے گی اور اس علاقہ کے داروغہ اور مُشرف سے جرمانہ لیا جائے گا (ص ۲۴۲-۲۴۳)۔ (۴۴)

- جہانگیر کی طبیعت جدّت پسند اور ادب دوست تھی۔ جو چیزیں اس کے ذاتی استعمال میں تھیں اُن کو بھی ادبی اور تاریخی رنگ دے دیتا۔ مثلاً خنجر، مرقّع، مرصّع جام اور سنگِ ساق سے بنی اپنی چوکی پر کندہ کروانے کے لیے اس نے شعرا سے حکماً کہا تھا کہ مناسب اشعار اور تاریخی قطعات کہیں۔ ملّا شکیبی اصفہانی اور سعید اگیلانی نے اشعار کہے۔ سعید اکے اشعار پسند کیے گئے اور مذکورہ اشیاء پر کندہ کیے گئے (ص ۶۰)۔ نظیری نے جام کے اطراف پر کندہ کرنے کے لیے اشعار لکھے تھے (ص ۲۳۲)۔

- جہانگیر نے **صَرف ہوائی** نامی کتاب کے تسمیہ کے بارے میں نکتہ طرازی کی (ص ۶۹)۔

- ''دریا'' نامی ایک ناخدا کے تین بیٹے تھے؛ اس کے بڑے بیٹے کا نام ''سمندر'' تھا اور دوسرے دو بیٹوں کا نام پیر محمد وغیرہ... تھا۔ جہانگیر نے خوش طبعی اور بدیہہ گوئی کا اظہار کرتے ہوئے ایک کو ''ساگر'' اور دوسرے کو ''گھر گھنبیر'' کا نام دیا۔ ساگر اور گھر گھنبیر کے معنی بھی بڑے سمندر کے ہیں (ص ۷۹)۔

- جب جہانگیر کے نام پر سونے، چاندی اور تانبے کے نئے سکّے ڈھالے گئے تو اس نے ان کے قدیم نام تبدیل کر کے نئے خوبصورت ناموں کا انتخاب کیا اور حکم دیا کہ فلاں سکّہ پر فارسی شعر، بادشاہ کا نام، دارالضرب کا نام اور

تاریخ کندہ کی جائے۔۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں اس نے ایک جدّت کا مظاہرہ کیا۔ ہر ماہ کے لیے نیا سکّہ ڈھالا جاتا اور اس کا نقش مختلف ہوتا۔ ہر نقش میں اس مہینے کے ذکر کے ساتھ ایک مختلف شعر بھی کندہ ہوتا تھا (ص ۲۱۱-۲۱۳)۔(۴۵)

فرنگی نوادر سے دلچسپی

-جہانگیر نے ثقافتی تبادلے اور یورپی ایجادات سے آشنائی کے لیے مغرب کے ساتھ تعلقات استوار کر رکھے تھے اور برّصغیر میں فرنگیوں کا داخلہ یکے بعد دیگرے شروع ہو چکا تھا۔ فرنگی علماء/پادری اس کے دربار میں ہمیشہ حاضر رہتے اور وہ فرنگ اور عیسائیت کے مسائل پر ان سے گفتگو کرتا (ص ۲۴۲)۔

-جو نوادر دوسرے ممالک سے اس کے دربار میں لائے جاتے وہ ہمیشہ اس کی دلچسپی کا باعث ہوتے۔ ماہ ربیع الاوّل ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء کی آخری شب جہانگیر کا زیادہ وقت چینی اور فغفوری پر کالہ دیکھنے میں گذرا (ص ۵۱)۔

-پرتگال کے حاکم نے اپنے سفیر کے ہاتھ یورپ سے عجیب وغریب تحائف بھیجے۔ تلوار، جیبہ، ڈھال، کچھ نایاب چیزیں، نغمہ سرا، سازندے اور اس سرزمین کے چند نئے ساز جیسے ارغنون، چغانہ اور آرہ پہ، جو چنگ کی طرح ہوتا ہے۔ جہانگیر نے پوری ایک رات یہ چیزیں دیکھنے اور یہ ساز سننے میں گذاری (ص ۶۶)۔

-مقرب خان بندر گجرات سے آتے ہوئے فرنگی اور دوسرے مغربی ممالک سے ہر قسم اور ہر جنس کے بہت سے نوادر دربار میں تحفۃً لایا تھا۔ ان میں سے وہاں کی لکڑی کے چند دستے بھی تھے (ص ۱۰۴)۔

-آگرہ کے نزدیک کھدائی کے دوران چاندی کا ایک قدیم سکّہ برآمد ہوا جس پر عجیب وغریب حروف اور نقوش کھدے ہوئے تھے۔ جہانگیر نے وہ سکّہ دربار میں موجود فرنگی دانش وروں کو دکھایا۔ انھوں نے تحقیق کر کے بتایا کہ یہ سکّہ ہزار سے زائد سال پرانا، فلاں فرنگی بادشاہ کا ہے (ص ۲۴۲)۔

موسیقی اور سماع سے دلچسپی

جہانگیر موسیقی سے بے حد رغبت رکھتا تھا اور ساز و آواز سے بہت متاثر ہوتا تھا اور اس پر رقّتِ قلب اور وجد طاری ہو جاتا تھا۔ یہ طے تھا کہ دیوان خاص میں رات کا ڈیڑھ پہر گذارنے کے بعد جہانگیر اپنے حرم سرا چلا جاتا۔ نغمہ سرا اور سازندے دونوں طرف کھڑے ہو جاتے اور فن کا مظاہرہ کرتے۔ ایسی ہی ایک رات کو مونا کلاونت اور سعید اللہ رابابی نے ایسا نغمہ گایا اور ساز بجایا کہ جہانگیر پوری طرح محو ہو گیا، اس پر وجد طاری ہو گیا اور سماع برپا ہو گیا۔ وہ مکمل بے قراری اور بے چینی کے ساتھ تقریباً ایک گھنٹہ تک بے خودی کے عالم میں روتا رہا (ص ۱۰۶-۱۰۷)۔

-ایک رات کچھ قوّال حافظ کے اشعار پر نغمہ سرائی کر رہے تھے۔ جہانگیر پر رقّت طاری ہو گئی۔ پھر اس نے جامی کی غزل پڑھنے کی فرمایش کی۔ یہ غزل سننے سے بے اختیار اس کا جسم متحرّک ہوا اور اس پر وجد طاری ہو گیا (ص ۱۷۹)۔

-ایک اور رات ماکو قوّال اور حمزہ قوّال نے مشفقی بخارایی کی غزل اور ایک رباعی پڑھی۔ جہانگیر کے جسم میں دو تین بار حرکت پیدا ہوئی (ص ۲۶۰)۔

-شہزادہ سلطان خرم [بعد میں: شاہ جہان بادشاہ] کی شادی کے جشن میں محفل موسیقی منعقد ہوئی۔ جہانگیر نے اس میں شرکت کی۔ سماع سے اس پر رقّت طاری ہوگئی (ص ۱۳۴)۔

- شوقی طنبورہ زن کو شاہی حکم پر تربیت دی گئی تھی۔ جہانگیر نے چند موتی (مروارید) اسے عطا کیے (ص ۲۷۶)۔

- جہانگیر نے قاضی سے پوچھا کہ جو نغمہ اور ساز ہم سنتے ہیں، حرام ہے یا حلال؟ قاضی اور بادشاہ کے درمیان ایک مکالمہ ہوا۔ قاضی اس کی حُرمت کی طرف اور بادشاہ اس کی حلّت کی طرف مائل تھا (ص ۲۳۷)۔

- جہانگیر نے نصیرا اصفہانی سے، جو گائیکی اور موسیقی کے فن میں اپنے عہد میں بے مثال تھا، نغمے سنے اور اس کی تعریف کی (ص ۴۷)۔

کتاب دوستی

- جہانگیر نے اپنی زندگی کے اوائل میں تاریخی کتابیں پڑھی تھیں اور ان کے بہت سے مضامین اسے زبانی یاد ہو گئے تھے۔ اس نے تقیا شوشتری سے کہا: ''تم **تاریخ فیروز شاہی**، **شاہنامہ** اور دیگر کتب تواریخ سے جو کچھ نقل کرتے ہو، اللہ کے کرم سے وہ مجھے سب زبانی یاد ہے۔ اگر تمھیں کوئی شک ہے تو جو قصّہ چاہو میں تمھیں تفصیل سے بیان کر سکتا ہوں۔'' (ص ۷)

-اس کے کتب خانے میں **انجیل مقدس** کا خطّی نسخہ بھی تھا (ص ۴۷)۔

-اس نے حکم دیا تھا کہ کتاب **جاویدان خرد** کا عربی سے فارسی ترجمہ کیا جائے۔ جب ترجمہ مکمل ہو گیا تو ایک خوش نویس کو حکم ہوا کہ نسخہ لکھے، تاکہ بادشاہ اسی نسخہ سے پڑھیں۔ یہ ترجمہ اس کتاب کے کچھ حصّے کا تھا اور ۱۵ اوراق سے زیادہ نہیں تھا (ص ۹۰)۔ بعد میں شاہی کتابخانے کے کتابدار عنایت اللہ شیرازی کی سفارش پر جہانگیر نے تقیا شوشتری کو حکم دیا کہ پوری کتاب کا ترجمہ کیا جائے (ص ۱۲۷)۔

-اس کی رات کی مجالس میں کتاب خوانی ایک معمول تھا (ص ۱۰۱، ۱۰۸)۔

-وہ تاریخی واقعات سننے میں دلچسپی رکھتا تھا (ص ۸۸، ۱۷۲)۔

- جہانگیر تُرکوں کی تاریخ اس قدر تفصیل سے جانتا تھا کہ خود تُرک حیران ہوتے تھے (ص ۱۸۳)۔

- جہانگیر کو امیر خسرو کے **تُغلق نامہ** کا ایک نسخہ ملا تھا جو ابتدا سے ناقص تھا۔ اس نے حیاتی گیلانی کو حکم دیا کہ اس کا دیباچہ مکمّل کرے جس میں حمد و سپاس الٰہی اور دوسرے ضروری موضوعات شامل ہوں۔ سعید اگیلانی کو بھی حکم ہوا کہ دو تین اشعار جن کا ایک ایک مصرع ضائع ہو چکا تھا، وہ پورے کر دے (ص ۱۰۸)۔

-یوسف یہود نے جہانگیر کے حکم پر **صحف ابراہیم** کا فارسی ترجمہ کیا (ص ۲۶۸)۔

-ایک دفعہ مجلس میں **تاریخ بیہقی** سے کوئی واقعہ بیان ہوا۔ جہانگیر نے کتابخانے سے **تاریخ بیہقی** کا نسخہ منگوایا تاکہ راست کتاب سے پڑھا جائے (ص ۲۷۵)۔

حکمرانی اور ذاتی اخلاق

جہانگیر اپنے ذاتی اخلاق سے ملک کا انتظام چلاتا تھا۔ وہ ذاتی طور پر ایک نرم دل انسان تھا اور لوگوں کی غلطیوں سے درگذر کرتا تھا (ص ۲۳)۔ پرانے خدمت گذاروں کے حقوق کا خیال رکھتا تھا۔ اس کی نظر ہمیشہ خوبیوں پر رہتی تھی اور عیب جوئی نہیں کرتا تھا (ص ۷۰)۔ وہ معاملات کے کُل اور جزء پر دھیان رکھتا تھا اور کام کے تمام پہلوؤں پر نظر ہوتی تھی اور نزاکت سے کام لیا کرتا (ص ۱۹۱)۔

-**مجالسِ جہانگیری** میں متعدد ایسے واقعات بیان ہوئے ہیں جو جہانگیر کے اندازِ سیاست اور حکم رانی پر دلالت کرتے ہیں اور اس کے طرزِ عمل کے بارے میں مؤلف کی رائے بیان ہوئی ہے جیسا کہ:

-نور قلیچ کو ایران کی سفارت پر بھیجا۔ اس مناسبت سے جو دستور العمل جہانگیر نے اسے دیا اور جو سامان اس کے ہمراہ کیا وہ اس کے تدبّر اور حکم رانی کا بہترین نمونہ ہے (ص ۲۰۱)۔

-نقیب خان دربار کا پرانا خدمت گذار تھا۔ اس کا بیٹا عبداللطیف ملحد ہو گیا اور الحاد کے جرم میں قید اور پابہ زنجیر ہوا۔ نقیب خان شفقت پدری کی وجہ سے بہت بے چین تھا۔ جہانگیر نے اس کی خدمت اور بڑھاپے کی عزت ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے بیٹے کو آزاد کر کے اس کے حوالے کر دیا (ص ۲۳)۔

-جہانگیر نے تقیا شوشتری کے بھائی قطبا کو بغیر کسی سفارش کے قید سے آزاد کر دیا (ص ۲۶۸)۔

-میرزا غازی نے ٹھٹھہ کے ایک امیر ابوالقاسم کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر اسے اندھا کر دیا تھا اور قید و بند کی بہت سی تکالیف دیں۔ جہانگیر نے اس کی دلداری کی اور اپنی نوازشات کا وعدہ کیا۔ چونکہ وہ گا بھی لیتا تھا، دلجوئی کے لیے جہانگیر نے اس سے گانا بھی سنا اور مبلغ پانچ ہزار روپے دیے اور دارالحکومت کے داروغہ کو خصوصی تاکید کی کہ اس شخص نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں، اسے اچھا اور سجا ہوا گھر دیا جائے تاکہ چند روز آسایش کے ساتھ گذار لے (ص ۲۶۷-۲۶۸)۔

-جہانگیر نے تخت نشینی کے پہلے سال ہی مجرموں کے اعضاء سزا کے طور پر کاٹنا ممنوع قرار دیا اور یہ حکم تمام صوبے داروں، جاگیرداروں اور کارندوں کو پہنچا دیا گیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ خدا کی خلقت کو ناقص کرنا بڑا گناہ ہے (ص ۲۰۶)۔ مؤلف تخت نشینی کے پانچویں سال کے واقعات میں لکھتے ہیں کہ ان پانچ سالوں میں بادشاہ نے ہرگز کسی کے بارے میں، چاہے اس نے کیسا ہی گناہ کیا ہو، اعضا کاٹنے کا حکم نہیں دیا (ص ۵۶)۔ (۴۶)

-جہانگیر نرم دل تھا اور دوسروں کو سزا دینے میں سفاکی اور سنگدلی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ اس نے اپنے ایرانی میر شکار کو، جو لوگوں کو سختی اور سنگدلی کے ساتھ سزا دیتا تھا، ایک ضابطہ دیا کہ لوگوں کے دلوں میں خوف اور سزا کا ڈر پیدا کرو لیکن تکلیف کم ہو اور خدا کی تخلیق میں نقص کا اندیشہ بھی نہ ہو (ص ۱۳۳)۔

-قلیچ خان پرانا خدمت گار تھا۔ جہانگیر اس کی منظوم عرضی پر، جو اس نے بھیجی تھی، کوئی صلہ دینا چاہتا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے تمام حاضرین سے پوچھا کہ قلیچ خان کو کیا صلہ دیا جائے۔ سب نے کچھ نہ کچھ کہا۔ نقیب خان نے تجویز

دی کہ بادشاہ سلامت بھی ایک شعر کہہ کر اس کو بھیجیں، یہ قلیچ خان کی انتہائی عزّت افزائی ہوگی۔ نقیب خان کی رائے پسند کی گئی اور جہانگیر نے اس کی تعریف میں ایک شعر کہا (ص ۶۱)۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جہانگیر اپنے وزراء کی رائے اور مشورے پر عمل کرتا تھا۔

- جہانگیر وسیع المشرب تھا اور کہتا تھا کہ ہم مظہرِ کُل ہیں۔ ایک دفعہ جہانگیر نے **مجالسِ جہانگیری** کے مؤلف عبدالستّار سے کہا تھا، اگر تم نصرانی ہونا چاہتے ہو تو ہمیں بُرا محسوس نہیں ہوگا۔ نصرانی ہونا بُرا نہیں ہے (ص ۱۷)۔

- جہانگیر فطرتاً انصاف پسند تھا۔ اس نے ایک بوڑھے شخص کو زمین کا ایک ٹکڑا دیا۔ پرگنے کا جاگیردار تین سال زبردستی اس زمین پر قابض رہا۔ سائل کو جہانگیر کے سامنے لایا گیا۔ جہانگیر نے اپنے مدارالمہام کو حکم دیا اور اُسی وقت زمین کی تین سالہ آمدنی کے برابر رقم سائل کو دے دی گئی۔ رقم پیش کرتے ہوئے مدارالمہام کی زبان سے نکلا: اتنا انعام! جہانگیر نے کہا، لفظ ''انعام'' کیوں کہتے ہو؟ یہ اس کا حق اور ملکیت تھی، وہ اپنا مال لے رہا ہے (ص ۲۰۸)۔

- جہانگیر انصاف کرنے میں کبھی ذاتی جذبات کو اثر انداز نہیں ہونے دیتا تھا۔ دادرسی کے بارے میں اس کا نظریہ تھا ''ہمارا ناراض ہونا موقوف، خلق خدا کو ناراض نہیں ہونا چاہیے، ہمیں خلق خدا کی حفاظت کے لیے بٹھایا گیا ہے۔ خدا گواہ ہے اگر میرا بیٹا بھی جرم کرے تو میں اسے باندھ کر قاضی کے حوالے کر دوں کیوں کہ ہمیں اسی لیے [یعنی انصاف کے لیے] حکمران بنایا گیا ہے۔'' (ص ۲۲۰)

- جہانگیر نے ''سوایی'' نام سے ایک سکّہ جاری کیا تھا جو اس کے والد کے جاری کردہ سکّے سے زیادہ وزنی تھا، لیکن بعد میں جہانگیر نے اپنا سکّہ منسوخ کر دیا۔ اس کی جو دلیل جہانگیر نے دی وہ اس کے طرزِ حکومت کی وضاحت کرتی ہے۔ جہانگیر نے کہا: ایک معمولی مصلحت کے پیشِ نظر کہ اس سے دنیا والوں کا فلاں فائدہ متوقع ہے، اکبر کا سکّہ بدل دینا درست نہیں۔ یہ ہمارے انصاف اور عدل سے بعید ہے کہ ہمارا ملک (زمین) تو وہی ہے اور اس پر کچھ اضافہ نہیں ہوا، لیکن ہمارے سکّے کا وزن بڑھا دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ عوام کو پرانے سکّے کی عادت ہوگئی ہے، عام و خاص سب اس کا حساب آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ ہر طرح سے خدا سے خلقت کی آسایش اور راحت مانگی ہے تو پھر عوام حساب کتاب کی مشکل میں کیوں مبتلا ہوں؟ اور صرّافوں کے ہیر پھیر سے نقصان کا بھی خوف ہو، خاص طور پر صحرانشینوں کو مشکل ہوگی (ص ۲۱۱)۔

- ایک رات اعتمادالدولہ نے، جس کے بھائی کو صوبہ پنجاب کا دیوان بنایا گیا تھا، عوام کی فلاح و بہبود اور ملک کی آبادی کے لیے کچھ تجاویز لکھ کر جہانگیر کو پیش کیں۔ چونکہ یہ سب باتیں خیرخواہی اور نیک نیتی سے لکھی گئی تھیں، باوجود اس کے کہ بظاہر خزانے کو چند لاکھ روپے کا نقصان ہونا تھا، جہانگیر نے انھیں بڑی خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ بعض ضابطے جو رعایا کی تکلیف کے باعث تھے اور سرکاری کارندے ان کے بہانے ظلم ڈھاتے تھے، جہانگیر نے انھیں منسوخ کر دیا اور کئی پرانے ضابطے ختم کر کے عدل و انصاف کی نئی طرح ڈالی (ص ۲۴۷)۔

- بنگال کے لوگ دریاؤں پر ''آل'' باندھتے تھے۔ یہ ایک لمبا چوڑا پل ہوتا تھا، جسے ہر سال ازسرِنو بنانا پڑتا

تھا۔ بارشوں کے موسم میں پانی زیادہ ہوجاتا تھا اور لوگوں کے لیے آمدورفت ممکن نہیں رہتی تھی اور مشکل میں پڑ جاتے تھے۔ جہانگیر نے ذاتی رحم دلی کی بنا پر حکم دیا کہ پل بنانے کے لیے شاہی خزانے سے ہر سال بیس ہزار روپے بطور مدد دیے جائیں، کیوں کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے بندوں کو آسودگی کے لیے چنا ہے۔'' (ص ۲۱۴)

- جہانگیر اپنے مقرر کردہ عمّال کے خلاف تحقیقات اور تفتیش کے لیے خفیہ کارندے مقرر کرتا تھا اور ان کی رپورٹوں پر اعتماد کرتا تھا (ص ۲۷۲)۔

عجز وانکسار اور خدمت کا صلہ دینا

جہانگیر بے جا شاہی غرور وتکبّر سے کوسوں دور تھا۔ اس کی طبیعت میں عجز وانکسار کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مؤلف اس سلسلے میں جب یہ کہتے ہیں کہ ''سبحان اللہ! عجز وانکساری کا کیا عالم ہے کہ تختِ آسمان پر بیٹھے ہیں اور خود کو زمین پر دیکھتے ہیں۔'' تو اس میں خوشامد اور چاپلوسی کا کوئی شائبہ نہیں ہے کیونکہ کتاب میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جن سے جہانگیر کا عجز وانکسار اور پرانے خدمتگاروں کے حقوق کا احساس جھلکتا ہے۔ مثلاً:

- ''ایک سقّے پر نظر مبارک پڑی۔ فرمایا کہ یہ سقّہ پرانے خدمتگاروں میں سے ہے۔ اسی وقت اسے تین تنخواہیں انعام میں دیں۔ پھر پوچھا کہ اس کی ماہانہ تنخواہ کتنی ہے؟ جو تنخواہ اس کی قدیم زمانے سے چلی آرہی تھی، خدمت کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ اس پر بادشاہ سلامت تعجب سے بار بار پوچھتے تھے۔ آخر فرمایا کہ اس نے ہمارے باپ کی خدمت بھی کی ہے اور ہماری بھی، یہ اب تک ''پیادہ'' کیوں ہے؟ چنانچہ اسے ''احدی'' (سوار) بنا دیا گیا۔ پھر ارشاد ہوا کہ صبر بہت اچھی چیز ہے! اس شخص نے اپنا معاملہ خود عرض نہیں کیا، خود عرض کرنا بے حیائی ہے (ص ۱۷۸-۱۷۹)۔

- انوپ رائے ہندو، اکبر کے زمانے سے شاہی ملازم تھا۔ غرّہ ذیقعد ۱۰۱۹ھ/ ۵ جنوری ۱۶۱۱ء کو شیر کے شکار کے دوران اس نے جہانگیر کو بچاتے ہوئے خود کو خطرے میں جھونک دیا تھا اور اس بنا پر جہانگیر اس کا احسان مند تھا۔ انوپ رائے ہندو اس واقعہ کے چند روز بعد جہانگیر کے دربار میں آیا۔ بادشاہ سلامت نے قدردانی، مہربانی اور بندہ پروری فرماتے ہوئے کہا: ''خدا کا شکر ہے، شکر ہے، خدا نے امان میں رکھا''۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ اس کے دونوں رخساروں پر رکھ کر اس کا ماتھا چوما اور فرمایا، حضرت مریم زمانی (یعنی جہانگیر کی والدہ) فرماتی تھیں کہ انوپ رائے بھی آپ کی طرح ہمارا فرزند ہے، جس طرح ہم آپ کو عزیز رکھتی ہیں اسے بھی عزیز رکھتی ہیں، کیونکہ اس نے اپنی جان آپ پر قربان کی ہے۔'' (ص ۱۷۴) جہانگیر نے اسے جڑاؤ تلوار اور ''انی راؤ سنگھ دلن'' کا خطاب عنایت کیا (ص ۱۷۵)۔ انوپ رائے چونکہ کسی دور دراز علاقے میں رہتا تھا جہانگیر گاہے بہ گاہے اسے وہاں تحفے بھی بھجوایا کرتا تھا (ص ۱۴۶)۔

- اسماعیل میر شکار کی موت نے جہانگیر کو بے حد افسردہ کر دیا تھا اور وہ کئی شبانہ مجلسوں میں مرحوم کی خوبیاں بیان کرتا رہا۔ جہانگیر نے جن الفاظ میں مرحوم کے بھائی کمال سے تعزیت کی، اس سے جہانگیر کی انسانی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جہانگیر نے کہا تھا: ''کمال! اسماعیل کی موت کا جتنا غم مجھے ہوا ہے میرے خیال میں، تم جو اس کے بھائی ہو، اتنا تمھیں بھی نہ ہوا ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ جتنا درد میں نے سہا ہے، تم نے نہیں سہا۔ خدا کی خدائی کی قسم! جو دُکھ مجھے ہے تمھیں نہیں

ہوا'' (ص ۲۴۶)۔ پھر جہانگیر نے کمال کو کچھ رقم دی کہ اس سے اسماعیل کی یاد میں کنواں اور سرائے بنوائے تاکہ صدقہ جاریہ ہو۔

دینی مسائل میں تحقیق

جہانگیر کو ہمیشہ سے دینی احکام و مسائل اور ان کی توجیہات جاننے کا شوق تھا اور وہ اپنے علم میں اضافے کے لیے درباری علما سے مسائل دریافت کرتا رہتا تھا۔ اس کی کچھ مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

- حدیث ''النّوم اخوالموت'' (نیند موت کی بہن ہے) کے معنی کی تحقیق (ص ۸۴)۔
- یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں حلال و حرام، سکّہ دار مچھلی کے حرام ہونے کا سبب اور اس ضمن میں جہانگیر کی توجیہ کہ کہ اہل تشیع سکّے دار مچھلی کیوں نہیں کھاتے (ص ۱۱۷-۱۱۸)۔
- قتل کفّار کا حکم اور قرآن مجید کی ناسخ و منسوخ آیات کا مسئلہ (ص ۱۲۱، ۱۲۴-۱۲۵)۔
- حدیثِ قدسی کے معنی کی تحقیق (ص ۱۲۶)۔
- طلاق کے فقہی احکام (ص ۲۳۶)۔
- فجر اور مغرب کی نمازوں کی رکعتوں کی تعداد کے سلسلے میں جہانگیر کی توجیہ (ص ۲۵۲)۔
- میّت کا ایک سے دوسری قبر میں منتقل کرنے کا شرعی حکم (ص ۲۵۶)۔

خوش طبعی اور خوش وقتی

جہانگیر خوش طبع تھا اور مصاحبوں اور حاضرین کے ساتھ لطافت اور خوش دلی سے گفتگو کرتا، تاکہ شاہی رعب و دبدبہ ان کے دل سے نکل جائے اور وہ اطمینان سے اپنا مدّعا بیان کر سکیں۔ خصوصی محافل میں وہ درباریوں کے ساتھ ہنسی مزاح بھی کیا کرتا تھا (ص ۲۴)۔

- تقیا شوشتری کانا تھا، ایک دن اس نے مجلس میں اپنا یہ شعر پڑھا:

مرا دیدۂ بخت بیدار نیست
وگرنہ ہنر پیش تو خوار نیست

(میرے ہی بخت کی آنکھیں بیدار نہیں ہیں، ورنہ تیرے ہاں فن کی ناقدری نہیں ہوتی)۔

جہانگیر نے بے ساختہ ہنستے ہوئے کہا: تمہاری تو آنکھ ہی نہیں ہے، آنکھ کی بیداری کہاں سے آئے گی؟ (ص ۴۱)۔

- دیانت خان کی ایک آنکھ کی بینائی کچھ کم تھی اور وہ لنگڑا بھی تھا۔ اس حوالے سے جہانگیر کبھی کبھار اس سے دل لگی کر لیا کرتا تھا۔ ایک بار جہانگیر نے اس سے مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھا:

نشود کارِ عالمی بہ نظام
گر نہ پای تو درمیان باشد

(اگر تمہارا پاؤں بیچ میں نہ ہو تو اس دنیا کا کام ٹھیک سے نہ ہو پائے) اور کہا کہ تم ایک پاؤں سے لنگ ہو۔ اگر یہ

بھی ٹھیک ہوتا تو دونوں جہانوں کے کاموں کے لیے کافی تھا! (ص ۲۵۸)

-شاہی اصطبل میں ایک گھوڑا شامل ہوا۔ اتفاق سے اس گھوڑے کی ایک آنکھ میں سفیدی تھی۔ جہانگیر نے دیانت خان نے مخاطب کر کے کہا کہ دیانت خان یہ گھوڑا تمہارا ''ہم چشم'' ہے! اس نے جواب دیا کہ ایک سر کے لیے ایک آنکھ بھی کافی ہوتی ہے۔ جہانگیر نے فی البدیہہ یہ مصرع پڑھا: ''کس نہ گوید کہ دوغ من ترش است'' -کوئی اپنی چھاچھ کو کھٹا نہیں کہتا- (ص ۲۳۹)

-وہ اصفہانیوں اور استرآبادیوں کے بارے میں کبھی کبھی یہ شعر خوش طبعی کے طور پر پڑھا کرتا تھا:

من صفاہانی و من سنّی و من سگ، من گدا

ہر چہ ہستم، استرآبادی نہ ام، شکرِ خدا (ص ۱۴۲)

(میں اصفہانی سہی، سنّی سہی، کتّا سہی، بھکاری سہی، سب کچھ سہی، خدا کا شکر ہے استرآبادی نہیں ہوں)

-دربار میں یہ ذکر چھڑا کہ ''صرف ہوائی'' کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ کسی نے کہا کہ چونکہ اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہے اور کوئی اسے نہیں جانتا، اس لیے اس کتاب کو ''صرف ہوائی'' کہا جاتا ہے۔ اور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کے معلّم خضر علیہ السّلام ہیں۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا کہ اس لحاظ سے تو اس کا نام ''صرف آبی'' ہونا چاہیے تھا، نہ کہ ''صرف ہوائی'' (ص ۶۹)۔

شکار دوستی

جہانگیر کو شکار کا بے حد شوق تھا۔ وہ ماہر تیرانداز تھا اور اس کا نشانہ کم ہی خطا ہوتا تھا۔ وہ اکثر زمینی یا دریائی شکار پر جاتا تھا۔ وقایع نویس اس کے شکار کے اعداد و شمار جمع کیا کرتے تھے۔ مثلاً ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء تک اس نے ۷۰ نیل گائیں، ۹ شیر (۵ نر اور ۴ مادہ)، ۴ ریچھ (۲ نر اور ۲ مادّہ) اور ایک مادّہ کفتار (مُردہ خور/لاش خور) شکار کیے تھے (ص ۱۵۹-۱۶۴)۔ وہ مختلف جانوروں کی اقسام اور ان کی خصوصیات سے بخوبی واقف تھا اور ان کے بارے میں حاضرین کو بتاتا رہتا تھا (ص ۶۴، ۸۰)۔ وہ شکار کیے ہوئے جانوروں کو بہت شوق سے دیکھا کرتا تھا (ص ۱۳۹، ۱۴۲) اور پھر موجود اُمرا اور خادموں میں بانٹ دیا کرتا یا خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے نام کی نذر کے طور پر مستحقوں کو کھانا کھلا دیتا تھا (ص ۱۴۸، ۱۵۷، ۱۶۲، ۱۶۸)۔ وہ اپنے ہمراہی شکاریوں کی حوصلہ افزائی کے لیے انھیں خطاب، منصب اور راشن دیتا تھا (ص ۱۵۸)۔ شکار کے فقہی مسائل اور جانوروں کا حلال و حرام ہونا علماء سے پوچھتا رہتا تھا (ص ۱۴۳-۱۴۴، ۱۴۹)۔ اُسے سلہوتریوں کی مہارت کے کئی واقعات یاد تھے (ص ۹۱)۔ اس نے شکار کے لیے کچھ اصول و قواعد وضع کر رکھے تھے جن پر وہ خود بھی عمل کرتا تھا اور میر شکار کو بھی ان پر کاربند رہنے کی ہدایت تھی۔ پانچ ماہ سے کم عمر کے میمنے کا شکار اور رعیّت کے کھیت کھلواڑوں اور فصلوں کو پامال کرنا منع تھا (ص ۱۲۹، ۱۳۳)۔ جہانگیر کا عقیدہ تھا کہ اتوار، جانوروں کی تخلیق کا دن ہے، لہٰذا اس دن نہ وہ خود کسی جانور کا خون بہاتا اور نہ ہندوستان کے طول و عرض اور دیگر زیرنگین ولایتوں میں کسی جانور کا خون بہایا جاتا۔ اتوار کو وہ مچھلی کا شکار کیا کرتا (ص ۱۶۲، ۱۶۸)۔ وہ کسی نہ کسی مناسبت سے اپنے شکار کے واقعات اور مشاہدات درباریوں کو بتاتا رہتا تھا (ص ۱۸۱)۔ اس کی خواہش تھی کہ شکار کے واقعات **جہانگیر نامہ** میں بھی شامل کیے جائیں (ص ۲۷۶)۔

آباواجدادکااحترام

جہانگیر، باپ کومجازی خدا کا درجہ دیتا تھا (ص۱۵، ۲۴۶)۔ جب جہانگیر نے سنا کہ شاہ طہماسب صفوی نے اپنے باپ کا لگایا ہوا باغ اُجاڑ دیا ہے اور باپ کا ذکر بے حرمتی سے کیا ہے تو اس نے بہت تعجب اور افسوس کا اظہار کیا۔ جہانگیر اپنے تمام اجداد کا-جن میں تیمور بھی شامل ہے- بہت احترام کرتا تھا۔اس کے دل میں تیمور کے نام اور مقام کی بہت قدر ومنزلت تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اور اپنے تمام اجداد کو اس لائق نہیں سمجھتا تھا کہ ان کا نام ''تمر'' (تیمور) ہو۔وہ کہتا تھا کہ اگر وہ سمرقند میں ہوتا تو روزانہ تیمور کے تخت کے پایوں کو بوسہ دیا کرتا (ص۲۷۷-۲۷۸)۔ جہانگیر اپنے باپ -اکبر- کا بہت احترام کرتا تھا (۴۷) اور کبھی کبھی اس کے نام کی قسم کھاتا تھا (ص۲۷)۔اکبر کے دَور کے جو منصب دار اور اہم اشخاص اس وقت تک زندہ تھے، جہانگیر ان کا خاص احترام کرتا اور انھیں اپنے عمائدین پر ترجیح دیتا تھا۔ جہانگیر نے غیاث الدین علی نقیب خان کو محض اس خیال سے احتراماً قدم بوسی نہ کرنے دی کہ وہ اکبر کے دربار سے وابستہ رہا ہے (ص۱۳۸)۔اس نے شیخ عبداللہ بن شیخ محمد غوث کی خصوصی عزت افزائی کی، کیوں کہ اکبر انھیں اپنا ''حقیقی بھائی'' کہا کرتا تھا (ص۴۸)۔اکبر کے زمانے کے ایک سقّے کو تین ماہ کی تنخواہ کے برابر انعام دیا اور اسے پیادہ سے احدی (سوار) بنادیا (ص۱۷۸-۱۷۹)۔ جہانگیر کے بچپن میں اکبر نے خواجہ سرا دولت اعتبار خان کو جہانگیر کی خدمت پر لگایا تھا۔ جہانگیر اس کے حقِ خدمت کا بہت خیال رکھتا تھا اور اسے چار ہزاری منصب دے رکھا تھا (ص۲۱۵)۔

جہانگیر اپنے درباریوں سے فرمائش کرتا تھا کہ اسے اس کے باپ کے واقعات سنایا کریں (ص۱۶۴-۱۶۵)۔ شاہی استعمال کی چیزوں اور جہانگیری سکّوں پر کندہ ہونے والے اشعار کے سلسلے میں اس کی خصوصی تاکید تھی کہ اس کے نام کے ساتھ ساتھ اس کے والد کا نام بھی اشعار میں آئے (ص۶۰، ۶۲، ۲۱۱-۲۱۲)۔ جہانگیر نے اکبر کے زمانے کے سکّے کو اپنے سکّے پر ترجیح دی اور اسے اسی طرح رائج رکھا (ص۲۱۱)۔ وہ اکبر کے قمری-اور شاید شمسی یوم وفات پر بھی-اس کی برسی منا تا تھا۔اس روز جہانگیر کے وزراء اور امراء اکبر کے مقبرے کی زیارت کو جاتے تھے۔ جہانگیر نے ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں مقبرے کی توسیع کے لیے نئے احکامات جاری کیے اور اس سلسلے میں کافی رقم مختص کی (ص۲۴۸)۔

فضول خرچی سے پرہیز

جہانگیر امراء، شاعروں، فنکاروں اور مستحقوں کو شایانِ شان صلہ ضرور دیتا، لیکن فضول خرچی نہیں کرتا تھا اور امرا اور انعام پانے والوں سے بھی یہی توقع رکھتا تھا کہ رقم کو فضولیات میں نہ اڑا دیں۔اعتبار خان خواجہ سرا نے جمنا کنارے عالی شان عمارت بنوائی تو جہانگیر نے اس کی یہ کہہ کر سرزنش کی: ''ایک خواجہ سرا گارے کی عمارت پر اتنی رقم کیوں خرچ کرے؟ اولاد تو ہوتی نہیں کہ یہ مکانات ورثے میں انھیں مل جائیں۔ بہتر نہیں کہ یہی رقم دلوں کی تعمیر میں صَرف کی جائے۔ بہتر ہوتا کہ تم یہی رقم اپنی زندگی میں اپنے ہاتھوں سے عاجزوں اور مسکینوں کو دے دیتے۔'' (ص۲۱۵)

- جہانگیر نے اپنے میر شکار اسماعیل کی وفات کے بعد اس کے بھائی کمال کو کچھ رقم دی تو ساتھ یہ بھی بتایا کہ اسے کہاں اور کیسے خرچ کیا جائے۔ ''پانچ سو روپے سے زیادہ رقم اسماعیل کی قبر کے چبوترے پر خرچ نہ کرنا کہ اس سے زیادہ، فضول خرچی ہوگی اور اسماعیل کی روح کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ بھائی چارے اور دوستی کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے نام

پر رفاہِ عامہ کی کوئی عمارت بنائی جائے۔'' (ص ۲۴۷)

- میرزا علی بیگ اکبر شاہی نے شکیبی اصفہانی کو اپنی مدح میں کہے ہوئے ایک قصیدے کے عوض تیس ہزار روپے صلہ دیا تھا۔ یہ افراط جہانگیر کی طبیعت کو کچھ اچھا نہ لگا اور اس نے کہا: ''سپاہی کا حق مارنا اور ایسے مواقع پر بے تکا خرچ کرنا بہت ناپسندیدہ ہے۔'' (ص ۴۰)

بعض دلچسپ حالات، عادات، معمولات اور رسوم

- جہانگیر جس تخت پر بیٹھتا تھا اُس کے اردگرد مہین پردہ لگا ہوتا۔ وہ کبھی پردے کے اندر سے بات چیت کرتا تھا اور کبھی ہاتھ سے پردہ ہٹا کر بات کرتا۔

- راتوں کو وہ دیر تک بیدار رہتا۔ اس کی اکثر محفلیں آدھی رات کو برپا ہوتی تھیں۔ بعض اوقات وہ بیچ محفل سے اٹھ کر حرم سرا میں چلا جاتا اور پھر واپس آجاتا (ص ۱۰۶)۔

- ۱۰۱۹ھ / ۱۶۱۰ء میں جہانگیر کی عمر ۴۶ برس ہوئی تھی۔ اس سے پہلے ہی اس کی داڑھی مونچھوں کے بال سفید ہونے لگے تھے۔ شروع شروع میں وہ کچھ عرصہ تک مونچھوں کے سفید بال قینچی سے کاٹ دیا کرتا تھا، جب ان کی تعداد زیادہ ہونے لگی تو اس نے یہ معمول چھوڑ دیا۔ اسی اثنا میں اس کے سر کے بال بھی سفید ہو گئے تھے، لیکن ان کی تعداد کم تھی (ص ۱۲۲، ۱۳۰)۔

- جہانگیر امرا کو انعام و اکرام دیتے وقت ان کے ناموں کی الفبائی ترتیب ملحوظ رکھتا تھا (ص ۱۴۸، ۱۶۸)۔

- وہ دیوالی کی رات نرد کھیلتا تھا (ص ۱۷۱)۔

- وہ عینک لگاتا تھا (ص ۱۹۴) اور شیشے کی گھڑی کا استعمال بھی کرتا تھا (ص ۱۳۱-۱۳۲)۔

- جہانگیر خوابوں پر بہت یقین رکھتا تھا۔ وہ جو خواب دیکھتا، حاضرین کو سناتا اور ان سے تعبیر پوچھتا (ص ۲۵-۲۶، ۵۷، ۱۱۰-۱۱۱، ۱۳۸)۔ اس نے خواب میں حضرت عیسیٰؑ کی زیارت بھی کی تھی (ص ۲۱۶)۔ کبھی کبھی وہ امرا سے فرمائش کرتا کہ اپنے خواب اسے سنائیں (ص ۵۷)۔

- جو لوگ اس کی محفل میں باریاب ہوتے تھے وہ شاہی تخت سے کچھ نیچے کھڑے ہوتے۔ پھر وہ اشارے یا حکم سے انھیں اوپر آنے کو کہتا۔ علما اور شعرا کو وہ ان الفاظ میں طلب کیا کرتا: ''مولایان بیایند، شاعران بیایند۔'' (ص ۱۴۸)

- جہانگیر کے امرا اور مقرّبین اپنے بچوں کی شادی کے موقع پر دولہا، دلہن کو سب سے پہلے بادشاہ کی سلامی کے لیے لاتے تھے اور جہانگیر انھیں خلعتیں دیتا تھا (ص ۲۳۰)۔

- جہانگیر نے اپنے زمانۂ شہزادگی ہی سے، چودہ پندرہ برس کی عمر میں شراب نوشی شروع کر دی تھی (ص ۱۲۸)۔ یہ عادت تخت نشینی کے بعد بھی برقرار رہی۔ وہ دوسروں کو شراب نوشی کی دعوت دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ افیون بھی کھاتا تھا۔ بعض اوقات افیون کو پانی میں گھول کر پیتا تھا (ص ۱۲)۔ اسے افیون کی مختلف اقسام کی پہچان تھی اور وہ درباریوں کو بھی اس کی خوبیاں بیان کرنے کا موقع دیتا تھا (ص ۲۵)۔

-شعر کہتے ہوئے وہ روایتی طریقہ اختیار کرتا، یعنی پہلے قافیہ اکٹھے کرتا اور پھر ان کے مطابق شعری مضمون سوچتا (ص۹)۔اس نے علم عروض نہیں پڑھا تھا (ص۲۴۹)۔

- جہانگیر ہندی زبان، اس کی تمام تر نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اتنی عمدگی سے بولتا تھا کہ **مجالسِ جہانگیری** کا مؤلف اس کے فارسی ترجمے سے عاجز آ گیا (ص۱۹۱)۔

- جہانگیر کی قوتِ مشاہدہ اور حافظہ غیر معمولی تھے۔اس نے ایک گجراتی برہمن کو بارہ برس پہلے کہیں دیکھا تھا اور پھر بارہ سال بعد اچانک اسے رات کو اپنی مجلس میں دیکھا تو نہ صرف پہچان لیا، بلکہ گذشتہ ملاقات کی تمام تر جزئیات بھی تفصیل سے بتائیں (ص۹۵-۹۶)۔

- جہانگیر عجیب فراست کا حامل تھا۔**مجالسِ جہانگیری** کے مؤلف نے اس حوالے سے دو واقعات قلم بند کیے ہیں (ص۲۵،۱۰۴)۔

حواشی

۱۔ **مجالس جہانگیری** میں مندرجہ ذیل صفحات پر عبدالستار کا نام آیا ہے: ۱۹،۲۳،۲۵،۳۰-۳۲،۳۴-۳۶،۳۹،۷۰،۷۱،۸۱،۸۹،۹۶، ۱۰۱،۱۰۷،۱۱۰،۱۴۸،۱۵۱،۱۶۶،۱۶۹،۱۸۶-۱۸۸،۲۶۵

۲۔ شمارہ I.O Islamic 940، ورق ۱۸۶الف

۳۔ StoreyC.A:Persian Literature, vol. 1, p. 164، نبی ہادی نے بھی اسی غلطی کا اعادہ کیا ہے کہ عبدالستار نے اپنے آبائی وطن بیجاپور سے ہجرت کی اور لاہور میں سکونت اختیار کی۔Dictionary of Indo-Persian Literature, p. 28

۴۔ Abdullah Chaghatai, "Mirat Al Quds An Illustrated Manuscript of Akbar's Period about Christ's Life", Lahore Museum Heritage, edited by Anjam Rehmani, Lahore, 1994, pp. 179-188

۵۔ سمرۃ الفلاسفہ، برٹش لائبریری، لندن، نمبر Or. 5893، ص۵

۶۔ ۱۰۰۰ھ میں عیسائیوں نے اکبر کی اجازت سے لاہور میں ایک مدرسہ قائم کیا تاکہ تیموری شہزادے پرتگالی زبان سیکھ سکیں۔اکبر کے بیٹے شہزادہ مراد نے اس مدرسے میں زبان سیکھی تھی۔ممکن ہے کہ عبدالستار نے بھی اس مدرسے کے اساتذہ سے استفادہ کیا ہو۔دیکھیے: Abraham Eraly, *The Mughal Throne,* London, 2004, p. 19

۷۔ **جہانگیرنامہ**، بہ اہتمام محمد ہاشم، تہران، ۱۳۵۹ش، ص۲۲۲

۸۔ ایضاً، ص۳۰۲،۳۰۳

۹۔ پروفیسر نبی ہادی نے سہل پسندی سے اس کی تاریخ تألیف ۱۰۳۷ھ/۱۲۲۷ء لکھی ہے: *Dictionary of Indo-Persian Literature,* p. 28 نہ ۱۰۳۷ھ کو تاریخِ تألیف قبول کیا جا سکتا ہے اور نہ ۱۲۲۷ء کی ۱۰۳۷ھ سے مطابقت ہے۔

۱۰۔ **سمرۃ الفلاسفہ**، نسخۂ لندن، ص۱

۱۱۔ ایضاً، ص۲۷۹

۱۲۔ ایضاً،ص ۱-۲

۱۳۔ ایضاً،ص ۴-۶

۱۴۔ ایضاً،ص ۹

۱۵۔ ایضاً،ص ۲۷۳

۱۶۔ ایضاً،ص ۲۷۵-۲۷۶

۱۷۔ نسخہ لندن کا ترقیمہ یہ ہے: ''بعونہ تعالیٰ کتاب لاجواب مسمّی السمرۃ الفلاسفہ حسب الحکم جناب معلی القاب مشیر الدولہ ممتاز الملک آنرایبل خلیفہ سیّد محمد حسین صاحب خان بہادر ممبر ایڈمنسٹریٹو کمیٹی یعنی انتظامیہ کمیٹی سرکار پٹیالہ، بہ قلم ناقص رقم بندہ کمترین شیخ خیرالدین بہ تاریخ ۲۴ اگست ۱۹۰۰ عیسوی مطابق ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۱۸ ہجری بہ روز جمعہ بہ اتمام رسید۔'' (ص ۲۷۹)

سیّد محمد حسین خان بہادر صاحب ممبر مجلس انتظامیہ، ریاست پٹیالہ نے یہ نسخہ لکھوایا تھا اور مسز بیوریج کو پیش کیا، جنھوں نے اسے برٹش میوزیم کو تحفے میں دے دیا، جیسا کہ اس کے اختتام پر لکھی ہوئی دو انگریزی یادداشتوں سے پتا چلتا ہے:

1. To H. Beveridge Esq, 216 Liver Poole Road, Willington, London with best compliments of Mashir-ud-Daula Mumtaz-ul-Mulk Khalifa Muhammad Hussain K.B. Member of the Administrative Council PAT IALA STATE,PATYALA, 10th Sep. 1900

2. Presented by H. Beveridge esq. November 13, 1900

نیز:

Rieu, Charles: *Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum,* Oxford, 1966, Vol.3, p.1077a

۱۸۔ Storey, I, 1110

۱۹۔ کتاب، مؤلف اور نسخوں کے بارے میں دیکھیے:

(Sir) Edward Maclagan, *The Jesuits and the Great Mogul,* London, 1932

خدا بخش لائبریری بانکی پور کے فارسی مخطوطات کی فہرست، جلد ۸ میں دو نسخے متعارف کرائے گئے ہیں۔ ایک کا نمبر ۶۴۹ ہے اور یہ ۱۹ ذوالقعدہ ۱۰۳۷ھ کا لکھا ہوا ہے اور دوسرے کا نمبر ۶۵۰ ہے جو عبدالرزاق قندھاری کا کتابت کردہ ہے۔ سالِ کتابت ۱۰۱۳ھ لکھا ہوا ہے جو مشکوک لگتا ہے۔

۲۰۔ لاہور عجائب گھر کا نسخہ ہم نے خود دیکھا ہے اور برٹش لائبریری کا نسخہ ڈاکٹر محمد سلیم مظہر صاحب نے دیکھ کر ہمیں یادداشت مہیا کی۔

۲۱۔ **مرآت القدس**، نسخۂ لاہور، ص ۴ الف، ۵ ب

۲۲۔ نسخۂ لندن، ۱۸۵ ب

۲۳۔ نسخۂ لندن، ۱۸۶ الف

۲۴۔ لندن کے نسخے کی ترقیمے کی عبارت یوں ہے: ''تمام شد حکایت مراتبات حضرت عیسیٰ مریم، بہ موجب فرمایش مستر چارد جانسین صاحب- زادہ قدرہ- بہ خط شیخ افاضت اللہ بہ مقام کلکتہ، سنہ ہزار و یک صد و ہشتاد و پنج ہجری مبارک۔''

نسخۂ لندن کے پہلے صفحے پر اس کتاب کے قارئین کی آگاہی اور تاکید کے لیے یہ عبارت ہے:

''راہنمونی و ہدایت صاحب ترجمہ برای خوانندگان ای عزیزان و محبوبان من! این داستان مسیح را پادری زیرو نموشویر بہ پاکیزگی نوشت زیرا کہ از

حدود کتب انجیل برآمدہ بسیار چیز ہای بیگانہ افزود؛ آن کہ یا نا یقین اند یا دروغ اند یا بہ بزرگواری خدا و بہ اخلاص دین انجیل مقدس مخالفت می نمایند بلکہ ہمان چیز را آن کہ از کتاب ہای انجیل مقدس آوردہ است، آن طور پلید ساخت کہ پاکیزگی و اثر و تمیت [!] خود را تلف کردند بنابرین در اعلیٰ بر ہر روی کاغذ [!] این داستان را آلودہ خواندیم تا ہیچ کس از راہ بردہ نشود پس خوانندگان را خوب تمیز کردن باید کہ از این ہا چہ چیز را قبول خواہند کرد یعنی ہر چہ بہ کتب انجیل مقدس ادامی دارد، آن را یاد بکنید و در حفظ خدا بشوید۔''

لاہور میوزیم کا نسخۂ اول و آخر اور درمیان سے ناقص ہے۔ اس نسخے کی اہمیت ان گیارہ تصویروں کی وجہ سے ہے جو مہارت سے بنائی گئی ہے، لیکن اپنی قدامت اور مالکین کی بے پروائی کی وجہ سے نسخہ اب خراب ہو چکا ہے۔ پہلے خالی صفحے پر تین یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ برّصغیر کے تیموری امرا کی تحویل میں رہا ہے۔ یادداشتیں یہ ہیں:

''این کتاب معجزات حضرت مسیح بہ قیمت پانصد روپیہ بہ تحویل محمد مراد بیگ'' اور اس کے ساتھ ایک مہر ثبت کی گئی ہے جس پر ''اکبر...'' کے الفاظ کندہ ہیں۔

۲۔ ''بدیہہ

عکس رخسارہ کہ در شیشہ عیان است ترا
بہ مہ و مہر شب و روز قران است ترا

حرّہ محرم غفر ذنوبہ۔''

اور مذکورہ یادداشت کی وضاحت کے لیے ساتھ یہ لکھا ہے:

''خطِ محرم - کوکۂ حضرت کامران میرزا - بہ تاریخ ۱۹ جمادی الاوّل سنہ ثلث وعشرہ والف بہ فرزند و نور دیدہ بہبود - طول اللہ تعالیٰ عمرہ - بخشیدہ را قمہ ع... [کاغذ کا کونا کٹا ہوا] غفر ذنوبہ۔''

اس نسخے کے تعارف اور اس کی تصاویر پر تبصرے کے لیے دیکھیے:

1. M. Abdullah Chaghatai, "*Mirat Al Quds* An Illustrated Manuscript of Akbar's Period about Christ's Life", *Lahore Museum Heritage*, edited by Anjam Rehmani, Lahore, 1994, pp. 179-188
2. Nusrat Ali and Khalid Anis Ahmed, "*Mirat Al Quds* (The Mirror of Holiness). *Dastan-i-Masih* Manuscript in the Lahore Museum, Lahore, Pakistan", *Lahore Museum Heritage*, edited by Anjam Rehmani, Lahore, 1994, pp. 189-204

مرآت القدس کا فارسی متن لاطینی ترجمے کے ساتھ شائع ہوا ہے، جس کے کوائف یہ ہیں:

Dastan-i-Masih: *Historia Christi persice conscripta, simulque multis modis contaminata... Latine reddita & animadversionibus notata a Ludovice de Dieu*. Leyden, 1639.

دیکھیے: Storey I, 1163-165

۲۵۔ حواری پیٹر (St. Peter) کے سوانح کا حصّہ مع لاطینی ترجمہ مندرجہ ذیل کوائف کے ساتھ شایع ہو چکا ہے:

Dastan-i-San Pedro Historia S. Petri persice conscripta simulque multis modis contaminata. Latine reddita & brevibus animadversionibus notata, a Ludovico de Dieu, Leyden 1639.

اس کا اُردو ترجمہ **نسخۂ کتاب بارہ اپسطل** عنوان سے Sasrdhanah میں ۱۸۹۴ء میں شایع ہوا۔ دیکھیے: Storey, I,165-66

۲۶۔ **خلاصۂ ظفرنامہ**، نسخۂ لندن، ورق اب

۲۷۔ ایضاً، اب-۱۳الف

۲۸۔ ایضاً، ۱۳۱ب

۲۹۔ لندن کے نسخے کے بارے میں تمام معلومات ڈاکٹر محمد سلیم مظہر صاحب کے ذریعے حاصل ہوئی ہیں، جنھوں نے لندن میں خود یہ نسخہ ملاحظہ کیا۔ نیز: Rieu,I,177b

۳۰۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن نے عبدالستار کی کتاب خلاصۂ ظفرنامہ کا انگریزی ترجمہ *History of India*، جلد۲، ص۳-۶ شامل کیا ہے۔ دیکھیے: Storey, 1, 287

۳۱۔ **جہانگیرنامہ**، ص۳۰۲-۳۰۳

۳۲۔ ایضاً، ص۴

۳۳۔ **تاریخ اکبری** بہ اہتمام معین الدین ندوی، اظہر علی دہلوی و امتیاز علی عرشی، رام پور، ۱۹۶۲ء سے طبع ہوئی ہے۔

۳۴۔ حالات اسد بیگ، اسد بیگ قزوینی (م: ۱۰۳۰ھ یا ۱۰۴۱ھ/۱۶۲۱ء یا ۱۶۳۱ء) کی تألیف ہے، تاحال طبع نہیں ہوئی۔ اس میں اکبر کے دورِ حکومت کے آخری چار سالوں (۱۰۱۱ تا ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۲ تا ۱۶۰۵ء) اور جہانگیر کے پہلے سال حکومت (۱۰۱۵ھ/۱۶۰۶ء) کے چشم دید واقعات ہیں۔ دیکھیے: جمشید نوروزی، ''نگاہی بہ نسخۂ خطّی حالات اسد بیگ قزوینی''، **قند پارسی**، دہلی، ۲۰۰۸ء، شمارہ ۴۱-۴۲، ص۳۷۳۔ معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار کسی ہندوستانی یونیورسٹی میں اس کتاب پر کام کر رہے ہیں۔ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد سلیم اختر (لاہور) کے پاس اس کے برٹش میوزیم، لندن (نمبر Or.1996) کے نسخے کا عکس ہے اور وہ بھی اس پر کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

۳۵۔ **نسخۂ زیبائے جہانگیر**، بہ اہتمام اسماعیل بیگ جانوف و سیّد علی موجانی، قم ۱۳۷۷ش/۱۹۹۸ء، ص۳۴۴-۲۶۶ میں یہ خاتمہ موجود ہے۔ اس حصے کی علیحدہ اشاعت: **خاطرات مطربی** بہ اہتمام عبدالغنی میرزائیف، مؤسسہ تحقیقات علومِ آسیای میانہ و غربی دانشگاہ کراچی، ۱۹۷۶ء

۳۶۔ **تذکرۂ مجمع الشعرائے جہانگیرشاہی**، بہ اہتمام ڈاکٹر محمد سلیم اختر، مؤسسہ تحقیقات علومِ آسیای میانہ و غربی دانشگاہِ کراچی، ۱۹۷۹ء

۳۷۔ ضیاء الدین دیسائی، ''اکبر کا پس از مرگ خطاب: عرش آشیانی یا عرش آستانی''، مشمولہ **نذر مختار**، مرتّبہ مالک رام، نئی دلّی، ۱۹۸۸ء، ص۱۳۹-۱۵۲

۳۸۔ **جہانگیرنامہ** کی پہلی تدوین سرسیّد احمد خان نے کی اور ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں غازی پور/علی گڑھ سے ٹائپ میں شایع کیا۔ منشی نول کشور نے ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں اپنے پریس میں اسے سنگی چھاپا۔ مس بیورج نے اپنے عالمانہ حواشی کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ کیا اور اعجاز الحق قدوسی کا اُردو ترجمہ سیّد حسام الدین راشدی کی نظرِ ثانی اور مفید یادداشتوں کے ساتھ دو جلدوں میں لاہور سے ۷۰-۱۹۶۸ء میں سامنے آچکا ہے۔ **جہانگیرنامہ**، محمد ہاشم کے اہتمام سے ۱۳۵۹ش/۱۹۸۰ء میں تہران سے بھی شائع ہوا ہے۔ مرتّب نے چار قلمی نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے باوجود اس اشاعت میں متن کی خواندگی اور اسمائے خاص کی سب سے زیادہ اغلاط ہیں۔ حواشی و تعلیقات (ص۵۱۷-۵۴۳) بہت سرسری ہیں۔ کتاب کے اشاریے میں غلطیوں اور خامیوں کی وجہ سے استفادہ محدود تر ہو جاتا ہے۔ **جہانگیرنامہ** کی از سرِ نو تصحیح و تدوین برّصغیر کے فارسی علمی اور علاقے کے ثقافتی حلقوں کی اب بھی اہم ضرورت ہے۔

۳۹۔ **جہانگیرنامہ**، تہران، ص۲۴۶

۴۰۔ قلمی نسخوں کی معروف فہرستوں، مثلاً فہرست نسخہ ہای خطی فارسی تألیف احمد منزوی، فہرستِ مشترکِ نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان تألیف احمد منزوی، کتابخانۂ خدابخش بانکی پور کے فارسی مخطوطات کی فہرست (انگریزی) تألیف مولوی عبدالمقتدر، فہرستِ نسخہ ہای خطی فارسی

کتابخانۂ رضا رام پور، فہرستِ مخطوطات فارسی برٹش میوزیم (Rieu)، فہرستِ مخطوطات فارسی انڈیا آفس (Ethe) میں عام طور پر برّصغیر کے مصنّفین کی تصانیف کا ذکر ملتا ہے، لیکن ان میں ایسی کسی کتاب کا نام ونشان تک موجود نہیں ہے۔ کتابیات کے موضوع پر اہم تألیفات اور مشہور کتابیاتی فرہنگوں، مثلاً Mughals in India تألیفِ مارشل، Persian Literature تألیفِ اسٹوری، Dictionary of Indo-Persian Literature تألیفِ نبی ہادی اور فہرستوارۂ کتاب ہای فارسی تألیف احمد منزوی وغیرہ میں بھی اس کتاب کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اسٹوری، مارشل اور نبی ہادی نے عبدالستّار کی دوسری تألیفات کا ذکر کیا ہے، لیکن مجالس جہانگیری کا نہیں۔ اگرچہ ابھی برّصغیر کے ہزاروں قلمی نسخے گمنامی میں پڑے ہیں اور اُن کی فہرستیں نہیں بنائی گئیں، لیکن جہانگیر کے دربار میں لکھی جانے والی ایسی کتاب کا برّصغیر کے کتابیاتی اور تاریخی مآخذ میں ذکر تک نہ ہونا حیرت انگیز ہے!

۴۱۔ جہانگیر کے دربار میں عیسائیوں کے داخلے کے لیے دیکھیے: امداد صابری، **فرنگیوں کا جال**، دہلی، ۱۹۴۹؛

Guerreiro Father Fernao: *Jahangir and the Jesuits*, Translated by C.H. Payne from the *Relations*; London, 1930

۴۲۔ دیکھیے: **تذکرۂ نسخۂ زیبای جہانگیر**، بہ اہتمام اسماعیل بیگ جانوف وسیّد علی موجانی، قم، ۱۳۷۷ش/ ۱۹۹۸ء، ص ۳۱۵-۳۴۱؛ اس کی جداگانہ اشاعت اس عنوان سے ہوئی ہے: **تذکرۃ الشعرای (اقتباسی از تذکرۃ الشعری مولانا مطربی الاصم سمرقندی مسمی بہ نسخہ زیبای جہانگیر)** بہ تصحیح ومقدمۂ عبدالغنی میرزا یف، مؤسسہ تحقیقات علوم آسیای میانہ وغربی دانشگاہِ کراچی، ۱۹۷۴ء سیّد حسام الدین راشدی نے کراچی ایڈیشن کے آخر میں ''حرفے چند'' کے زیرعنوان ایسے شواہد پیش کیے ہیں جن کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ جہانگیر نے جس تذکرے کو اپنے زمانۂ شاہزادگی کی تصنیف قرار دیا ہے اور اسے ملّا مطربی کو دے دیا تھا، یہ دراصل ۳۴ سال پہلے خواجہ نظام الدین بخشی ہروی نے لکھا تھا اور اپنی کتاب **طبقاتِ اکبری** میں شامل کیا تھا۔ دونوں تحریروں یا روایتوں میں بہت کم فرق ہے (ص ۸۰-۸۵)۔ جہانگیر نے **جہانگیرنامہ** میں مختلف شاعروں کے کلام کا انتخاب دیا ہے جو بلاشبہ ان کا بہترین نمونۂ کلام ہے (مثلاً ص ۳۲۴، ۳۲۵)۔

۴۳۔ **مرقعِ جہانگیر** کے ۹۰ اوراق کتابخانۂ سلطنتی، تہران میں نمبر ۱۶۶۳-۱۶۴۶ کے تحت محفوظ ہیں۔ جنھیں **مرقع گلشن** کا نام دیا گیا ہے۔ ۲۵ اوراق برلن کے قومی کتب خانے میں محفوظ ہیں جو ۱۹۲۴ء میں، برن سے Earnst Kuhnek اور Hermann Goetz کے اہتمام سے، *In Dische Buchmalerei aus dem Album in Der seatbibtiothek Berlin* کے نام سے شایع ہوئے۔ دیکھیے: **فہرستِ مرقعاتِ کتابخانۂ سلطنتی**، تألیفِ بدری آتابای، تہران، ۱۳۵۳ش، ص ۳۳۴-۳۶۸، شمارہ ردیف ۱۵۹

۴۴۔ جہانگیر مصوّری کا دلدادہ تھا۔ وہ مصوّروں کی حوصلہ افزائی کرتا اور خود انھیں خیالات سُجھاتا اور وہ تصویریں بناتے۔ مصوّروں نے کئی تصاویر اس کے حکم سے شکار کے مناظر، عجیب الخلقت جانوروں، پرندوں اور درختوں کی بنائیں۔ عنایت خان کی کمزوری اور بیماری کی حالت میں تصویر، ہندو جوگی جدروپ کی تصویر اور اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کرتے ہوئے جہانگیر کی تصاویر بھی حکماً بنائی گئیں۔ اس نے ایک ہندو مصوّر بشن داس کو اپنے سفیر خان عالم کے ساتھ ایران بھیجا، تاکہ شاہ عباس اور دربار کے دیگر امراء کی تصاویر بنائے۔ ہندوستان میں تیموری عہد کے مصوّروں کی تصاویر میں، جہانگیر کے عہد کے مصوّروں کی تصاویر کی تعداد دنیا کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں کہیں زیادہ ہیں اور فنّی محاسن کے اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ جہانگیر کے ذوقِ مصوّری پر روشنی ڈالنے کے لیے متعدد کتب دستیاب ہیں جن میں سے اہم یہ ہیں:

محمد عبداللہ چغتائی، **جہانگیر کا ذوقِ مصوّری**، لاہور، ۱۹۶۱ء

Binyon, Lawrence: *The Court Painters of the Great Mughuls*, with introduction by Thomas

W. Arnold, London, 1921

Brown, Percy: *Indian Painting under the Mughals*, Oxford, 1924

Clarke, C. Stanley: *Indian Drawings*, London, 1992

Kuhnel, Ernest and Goetz, Hermann: *Indian Book painting from Jahangir's Album in the state library in Berlin*, London 1929

Kuhnel Earnest: *Miniaturmalerei in Islamicshen Orient*, Berline, 1923

Coomarswamy, Anada K., "Portrait of Gosain Jadrup", *Journal of the Royal Asiatic Society*, London, July 1919, pp. 389-410

۴۵۔ جہانگیر کے سکّوں کے سلسلے میں ان کتب کا مطالعہ مفید ہے:

-شمس اللہ قادری، حکیم سیّد، **سکّہ جات سلاطین مغلیہ کی ابیات**، مطبع شمسی، آگرہ، ص ۲۶

-محمد رفیع موہانی، **گنج شایگان**، مرادآباد، ۱۹۰۳ء، ص ۲۱۹

-نور محمد اکیلوی، سیّد، **سکّوں پر اشعار**، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۳ء، ص ۷۳-۸۲: ۱۵۲-۱۵۹، الواح ۴ ب، ۵، ۶

C. J. Brown, *Catalogue of Coins in the Provincial Museum Lucknow*, Dehli, 1986, vol. 1, pp. 18-28

The Catalogue for the sale of tojent? gold Mohars of Jahangir and Shah Jahan,Geneva,1987,pp.6,9

Lane-Pool,Stanley:*The Coins of the Moghul Emperors of Hindustan in the British Museum*,Edited by R.S.Poole,London,1892;reprint:Delhi,1983,pp.9-368

Whitehead,*Catalogue of Coins in the Punjab Museum Lahore*,Oxford,1914,pp.119-172

Whitehead,R.B: *Coins of the Moghal Emperors*,Oxford,1914

۴۶۔ مؤلف نے اس ضمن میں مبالغہ کیا ہے۔ اگرچہ جہانگیر کے اصولِ حکمرانی ایسے ہی تھے لیکن کئی بار اُن کی خلاف ورزی بھی ہوئی۔ وہ خود **جہانگیر نامہ** میں لکھتا ہے: ''۲۲ ذیقعدہ ۱۰۱۸ھ/۱۶۱۰ء کو میں [دوران شکار] ایک نیل گائے پر قابو پانے ہی والا تھا کہ اچانک ایک جلودار اور دو کہار سامنے آ گئے اور نیل گائے بِدک کر بھاگ گئی۔ غصّے کی شدت میں مَیں نے حکم دیا کہ جلودار کو وہیں قتل کر دیا جائے اور کہاروں کے پاؤں کاٹ کر گدھے پر سوار کر کے لشکر میں پھرایا جائے، تاکہ کوئی دوسرا ایسی جرأت نہ کرے'' (ص ۹۴)۔ جہانگیر نے مقرّب خان کے ایک نوکر کے ہاتھوں کے دونوں انگوٹھے کاٹنے کا حکم بھی دیا تھا جس نے گجرات کے ایک باغ میں چنبہ کے پھولوں کے چند پودے کاٹ دیے تھے۔ (**جہانگیر نامہ**، ص ۲۴۶)

۴۷۔ یہ احترام اپنی جگہ، لیکن اکبر اور جہانگیر کے باہمی روابط اتنے اچھے نہیں تھے، اکبر نے ۱۰۰۱ھ/ ۱۵۹۳ء میں اپنی شدید بیماری کے دوران جہانگیر پر الزام لگایا کہ اس نے باپ کو زہر دیا ہے۔ ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹-۱۶۰۰ء میں جہانگیر نے باپ کے خلاف بغاوت کی اور الٰہ آباد میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔

☆☆☆

محمد عابد حسین (پروفیسر)
صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

تاریخ ہند کا اہم مآخذ:۔ ملخص شاہجہاں نامہ

تیموری بادشاہوں کو تاریخ نگاری سے خاص دلچسپی تھی اس لئے ہر ایک بادشاہ نے خصوصی توجہ دی اور اپنی سرپرستی میں ماہر دانشوروں کو اس کام پر مقرر کیا جس کا نتیجہ رہا کہ فارسی کی معتبر تاریخی تصانیف وجود میں آئیں، اکبر (۹۳۳۔۱۰۱۴ھ)، جہانگیر (۱۰۱۴۔۱۰۳۷ھ) اور شاہجہاں (۱۰۳۷۔۱۰۶۸ھ) کے زمانہ میں متعدد تاریخی کتابیں لکھی گئیں۔ یہ سب سلاطین خود تنکہ فہم اور سخن سنج تھے اور قدرت نے ایک فطری ذوق ودیعت کیا تھا اس لئے اتنا زبردست کام تاریخی نویسی وجود میں آیا کہ آج ہم کسی طرح اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے اور ہندوستان کی تاریخ اس سرمایہ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔

شہاب الدین محمد شاہجہاں (م۱۰۶۸ھ) نے گرچہ علمی میدان میں کوئی کارنامہ نہیں چھوڑا لیکن وہ صاحب ذوق تھا اور شاہی بخششوں اور عنایتوں سے ادباء، شعراء اور فنکاروں کو فیضیاب کر رہا تھا۔ ابو طالب کلیم ہمدانی کو ملک الشعراء کا خطاب عطا کر کے شعر وادب کی مستقل آبیاری کرتا رہا۔ شاہجہانی دور جہاں بہت ساری تاریخی یادگاریں اور جاودانی کارناموں کے لئے مشہور ہے وہیں فارسی تاریخ نگاری کے اعتبار سے درخشندہ اور یادگار دور ہے۔ اس دور میں شاہجہاں نے تاریخ نویسی کی ترویج واشاعت میں کلیدی رول ادا کیا اور ٹھوس اقدامات کئے۔ مثلاً:

☆ تاریخ نگاری کا ایک خاص شعبہ اپنے دربار میں قائم کیا اور مشہور مورخین اور ماہر دانشوروں کو اس کام مقرر کیا۔
☆ شاہی انعام واکرام اور حسب مراتب عطایا کے مورخین کو نوازنا شروع کیا۔
☆ مختلف زبانوں کی مشہور اور اہم تاریخی کتابوں کو فارسی زبان میں منتقل کرنے کے لئے ایک شاہی فرمان جاری کیا۔
☆ منظوم تاریخ نویسی کا ایک ماحول قائم کیا اور ملک الشعراء کلیم ہمدانی کو منظوم بادشاہ نامہ لکھنے پر مقرر کیا۔ اور قدسی مشہدی نے ظفر نامہ شاہجہاں منظوم اور یحیٰ کاشی نے بادشاہ نامہ منظوم لکھا۔
☆ شعوری اور تکنیکی اعتبار سے تاریخ نویسی کو اس دور میں سب سے زیادہ ترقی ہوئی۔

یہاں پر ہم محمد طاہر آشنا مخاطب بہ عنایت خان کی معرکۃ الآرا تالیف ''ملخص شاہجہاں نامہ'' کا ایک مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ ''پادشاہ نامہ'' کی تصنیف کا کام سب سے پہلے میرزا امینای قزوینی کو سونپا گیا۔ اس نے شاہجہاں کے ابتدائی دس سال کے حالات کو جمع کیا۔ اس کے بعد ملا حمید لاہوری ناظم پٹنہ کو یہ کام سونپا گیا۔ ملا عبدالحمید لاہوری نے ابوالفضل کے اکبر نامہ کو پیش نظر رکھ کر اسی طرز نگارش میں شاہجہاں کے بیس سال کے حالات (۱۰۵۷۔۱۰۳۷ھ/۱۶۴۷۔۱۶۲۸م)

کے حالات کو عبدالحمید لاہوری کے طرز تحریر میں لکھا۔

بعد میں محمد طاہر آشنا نے سادہ اور سلیس عبارت میں شاہجہانی عہد کے اس تیس سالہ (۱۰۶۸۔۱۰۳۷ھ/۱۶۵۸۔۱۶۲۸م) حالات کو جو تین جلدوں میں تھا اسے ۱۰۶۸ھ میں ایک جلد میں اختصار کے ساتھ جمع کر کے ''ملخص'' نام رکھا۔ وہ ملخص میں لکھتے ہیں کہ:

''راقم ہم کہ اباً عن جدنمک پروردۂ این دودمان خواقین نشان است بہ تحریر سوانح دولت ابدی الاتصال شاہجہان پرداز دودر تلخیص آن کوشیدہ وخلاصۂ احوال ومعظم امور از مجلد سہ گانہ پادشاہ نامۂ شیخ عبدالحمید مذکور بدر نویسد و بہ عبارت واضح درآوردہ، تاریخ مختصری ترتیب دہد، فضولی نکردہ خواہد بود، بلکہ درین صورت فواید آن عموم ہم خواہد رسانید۔ لہٰذا شروع درین امور نمودہ، دررض اندک فرصتی بہ توفیق اللہ تعالیٰ فارغ گردید۔ از سال چہارم جلوس تا دہم بیشتر از روی پادشاہ نامۂ نوشتۂ محمد امینای قزوینی، مشہور بہ امینای منشی کہ واضح تر است، نوشتہ شدہ۔ چوں ملخص وقائع تحریر یافتہ، این نسخہ را بہ ملخص موسوم گردانید۔''

میرزا محمد طاہر آشنا مخاطب بہ عنایت خان بن میرزا میرزا احسن اللہ احسن، مخاطب بہ ظفر خان بن خواجہ ابوالحسن تربتی، عہد شاہجہانی کی مشہور اور معتبر شخصیت رہے ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت کے بارے میں مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ لیکن اسی ملخص کی ایک عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی پیدائش ۱۰۳۶ھ میں ہوئی تھی:

''درین مکان فیض نشان جشن وزن قمری اختتام سال چہل و چہارم از عمر ابد طراز بہ میان آمد و ہفتم ربیع الثانی (۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴م) کہ ساعت مختار بود ..... از جمہ این شیرازہ بند سوانح اقبال کہ در آن وقت ہفت مرحلہ از مراحل زندگانی طی نمودہ بود، باوجود صغر سن بہ منصب درخور سرفرازی یافت۔''

اس عبارت سے استنباط ہوتا ہے کہ محمد طاہر آشنا کی پیدائش ۱۰۳۶ھ مطابق ۱۶۲۷ میلادی میں ہوئی تھی۔

''بزرگ خانم'' عنایت خان کی ماں، سیف خان کی بیٹی اور ممتاز محل زوجۂ شاہجہان کی بڑی بہن تھی۔

جب محمد طاہر آشنا کی عمر سات سال کی ہوئی تو شاہجہاں نے اسے منصب عطا کیا اور بھی وقتاً فوقتاً مناصب اور شاہی عطایا سے سرفراز کرتا رہا جس کا تذکرہ اس نے خود ملخص میں کیا ہے۔ ان کے والد ظفر خان احسن چوں کہ خود شاعر اور شاعر پرور تھے اس طرح باپ کی تربیت کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے اور شاہجہاں کے ندماء میں شامل ہو گئے۔ شاہجہاں نے سب سے پہلے اس کو داروغہ حضور (وزیر دربار) کا عہدہ عطا کیا۔

حسین قلی خان عاشقی نے نشتر عشق میں لکھا ہے کہ:

میرزا محمد طاہر نام عنایت خان و خان زمان خطاب داشت۔ خلف الصدق ظفر خان احسن پسر خواجہ ابوالحسن تربتی است کہ بہ عہد جہانگیری بہ وزارت عالی و منصب پنج ہزاری رسیدہ بود۔ مرد بی نظیر و بی بدل بود و در نظم و نثر سلیقہ تمام داشتہ و در خوش صحبتی و بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی انگشت نمای یاران بودہ۔ تاریخ شاہنامہ صاحبقران ثانی و شاہجہان پادشاہ غازی از دیگران خوب و بلیغ نوشتہ و مثنوی در صعوبت راہ

کشمیر رنگین و معنی یاب گفتہ۔ مثل ابو طالب کلیم وغیرہما در صحبت او حاضر شدند و بہ منصب یک ہزار و پانصدی ذات سرفرازی داشت در عہد عالمگیر پادشاہ انزوا گرفت۔''

۱۰۶۸ھ میں آشنا کو ''شاہی کتابخانہ'' کے داروغگی کا منصب عطا ہوا اور اسی سال اپنے اس تاریخ ''ملخص'' کی تالیف میں مشغول ہو گئے۔ آخری عمر میں انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور کشمیر چلے گئے۔ آزاد بلگرامی اور عاشقی عظیم آبادی کے مطابق ۱۰۸۱ھ مطابق ۱۶۷۰ میلادی میں آشنا نے انتقال کیا۔ عاشقی لکھتے ہیں:

''در سن یک ہزار و ہشتاد و یک ہجری مطابق ۱۶۷۰م بہ رحمت حق پیوست۔ مولف باوجود نا آشنایی می گوید، قطعہ:

زمانہ خاک بر سر کرد از غم — عنایت خان چون در زیر لحد خفت
سن او عاشقی با شیون و درد — برفتہ آشنا ای وا کجا گفت

آثار آشنا۔ آشنا کے علمی آثار اس طرح ہیں:

☆ کلیات آشنا:۔ اس کلیات میں قطعات، ترجیع بند، وصف دہلی، عزا، رباعیات اور فرد شامل ہیں۔ اس کا آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے:

اگر جمال پری روی من بیند حور — شود ز غایت انصاف معترف بہ قصور

☆ دیوان آشنا:۔ اس دیوان میں ۱۸۱ اورق ہیں۔

☆ مثنوی در صعوبت راہ کشمیر:۔ اس مثنوی میں کشمیر کے سفر میں جو پریشانیاں پیش آئی ہیں اس کا تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ مآثر الکرام، شمع انجمن، نشتر عشق، کلمات الشعراء، ریاض الشعراء، تذکرہ شعرای کشمیر، تذکرہ طاہر نصر آبادی، مآثر الامراء اور بزم تیموریہ وغیرہ میں آشنا کے بہت سارے اشعار نقل کئے گئے ہیں۔

اس کتاب کو جو ملخص / شاہجہاں نامہ / قرینۂ شاہجہان پادشاہ وغیرہ نام سے مشہور ہے، ۱۰۶۸ھ میں محمد طاہر آشنا نے ترتیب دیا ہے۔ ملخص کے مقدمہ میں کمال صداقت کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ میں نے ۱۰۶۸ھ میں شاہی کتابخانہ کی داروغگی کے زمانہ میں اپنے ہم عصر امینای قزوینی، عبدالحمد لاہوری اور محمد وارث لاہوری کی تالیف شدہ ''پادشاہ نامہ'' کا خلاصہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ جس میں الگ الگ دس سال کے حالات درج ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے واقعات بابری، اکبر نامۂ ابوالفضل، طبقات اکبر شاہی، اقبال نامۂ جہانگیری اور غیرت خان نقشبندی کی مآثر جہانگیری سے بھی استفادہ کیا ہے۔

محمد طاہر آشنا کی یہ کتاب ایک مقدمہ ایک خاتمہ کے علاوہ تین حصول پر مشتمل ہے ہر ایک حصہ میں دس دس سال کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ ہر سال کی نشاندہی کرتے ہوئے مختلف عنوان کے تحت تفصیل درج ہے اور ہر حصہ کے اخیر میں زمانہ کے مشہور و معروف شخصیتوں کا تعارف ضمیمہ کے طور پر شامل ہے۔ ترتیب اس طرح ہے:

☆ مقدمہ:۔ مقدمہ میں شاہجہاں کے جد امجد امیر تیمور گورگانی سے لے کر شاہجہاں کے والد جہانگیر تیموری تک کی مختصر

تاریخ اور شاہجہاں کے تولد (۱۰۰۰ھ) سے تخت شاہی پر جلوس (۱۰۳۷ھ) تک کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

☆ حصہ اول:۔اس حصہ میں شاہجہاں کی حکومت کے اول دس سال یعنی ۱۰۳۷ھ سے ۱۰۴۷ھ کے واقعات درج ہیں۔

☆ حصہ دوم:۔اس حصہ میں شاہجہانی دور کے دوسرے دس سال یعنی ۱۰۴۷ھ سے ۱۰۵۷ھ تک کے حالات کو بیان کیا گیا ہے۔

☆ حصہ سوم:۔اس حصہ میں تیسرے دس سال یعنی ۱۰۵۷ھ سے ۱۰۶۷ھ تک کے واقعات شامل ہیں۔

☆ خاتمہ:۔آشنا نے شاہجہانی دور میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی جغرافیائی حالت اور اس سے متعلق مفید معلومات کے علاوہ اس زمانہ کے مشاہیر اور معروف شخصیتوں کا تفصیلی جائزہ بھی خاتمہ میں پیش کیا ہے۔

ملخص کی تاریخی اہمیت:۔

محمد طاہر آشنا کی ''ملخص شاہجہان نامہ'' ایک جامع ترین تاریخ ہے۔ جو زمانہ تحریر سے ہی مرجع اور مآخذ کی حیثیت کی حامل رہی ہے۔شاہجہاں کے دور حکومت (۱۰۳۷ھ۔۱۰۶۸ھ/۱۶۲۸ء۔۱۶۵۸ء) کے تیس سالہ حالات اور واقعات بجز آخری سال، جو کہ سال تحریر ہے اس کتاب میں درج ہے۔مواد اور مطالب کے لحاظ سے بھی اس کتاب کو دیگر تمام تاریخی کتابوں پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔مولف نے حصہ اول اور حصہ دوم میں گرچہ اختصار سے کام لیا لیکن حصہ سوم میں انہوں نے بہت تفصیل سے تاریخی واقعات کو بیان کیا ہے بلکہ اپنے پیشرو مولفین کے فراہم کردہ اطلاع پر ہی اکتفا نہ کر کے ذاتی مشاہدہ اور شخصی تجربہ سے بھی کام لیا ہے۔اور چوں کہ مولف کتاب کی حیثیت شاہجاہس کے دربار میں کافی اہم ہے کلیدی عہدہ پر حکومت میں انہوں نے کام کیا ہے۔اس لئے ''صاحب البیت یعرف مافی البیت'' کے مصداق واقعہ کی صداقت کے اعتبار سے بھی ملخص کی حیثیت ممتاز ہے۔مزید یہ کہ مولف نے کاتمہ میں ملک کی جغرافیائی کیفیات کا اضافہ کر کے کتاب کی ارزش کو دوبالا کر دیا ہے۔شاہجہاں کے زمانہ میں ہندوستان اور اس کے مختلف صوبوں کا جو نقشہ تھا ساتھ ہی مختلف علاقوں کی آب و ہوا، موسم، پہاڑ، قدرتی مناظر اور دیگر جغرافیائی معلومات کا اضافہ کر کے مولف نے کتاب کی جامعیت کو مسلم بنا دیا ہے۔تکنیکی اعتبار سے بھی یہ کتاب گرانقدر تاریخی شاہکار ہے۔

ملخص شاہجہاں نامہ کی عبارت سادہ، رواں، سلیس اور دل انگیز ہے۔آشنا نے بھی کتاب کے مقدمہ میں اس وضاحت کی ہے چوں کہ لاہوری، قزوینی اور وارث کے بادشاہ نامہ کی عبارت مصنوع اور تکلف آمیز ہے اور اس قدر لفظی بازیگری سے کام لیا گیا ہے کہ قاری کے لئے اصل تاریخ کو سمجھنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سا لگنے لگا اس لئے ہم نے اہم تاریخی مواد کو سہل اور آسان عبارت میں تحریر کر کے کتاب کی افادیت کو عام کر دیا اور تاریخ کے جاننے والوں کو اصل حقیقت تک پہونچانا آسان ہو گیا۔یہ کتاب ہر طرح کی انشاء پردازی، تعقید لفظی اور عبارت کی پرکاری سے پاک اور سہل نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔تمام تاریخی مطالب اور اہم وقائع کو انہوں نے عام قاری کے لئے بھی آسان کر دیا ہے۔اس طرح کتاب کی افادیت اپنے ہم عصر تمام کتابوں سے بڑھ گئی ہے۔

اس کتاب کے کئی خطی نسخے دنیا کی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ۲۰۰۹ء میں مرکز تحقیقات فارسی، خانہ فرہنگ ایران نئی دہلی نے دکتر جمیل الرحمان کے تصحیح وتحشیہ کے ساتھ ملخص شاہجہان نامہ کو چھاپا ہے۔ ڈاکٹر اصغر آفتاب کے مطابق اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ''سرگرد فلر'' نے کیا تھا جس کا خطی نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔ چند سال قبل جناب بیگلی اور ضیاء الدین ڈیسائی نے بھی مل کر اسی نسخہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

مآخذ ومنابع:۔

۱۔ آرزو گوالیاری، سراج الدین علی خان۔ مجمع النفائس۔ کتابخانہ خدابخش۔ پٹنہ
۲۔ آزاد بلگرامی، میر غلام علی۔ مآثر الکرام۔ لاہور۔ ۱۹۱۳ء
۳۔ آشنای شاہجہاں، میرزا محمد طاہر خان۔ ملخص شاہجہاں نامہ۔ دہلی۔ ۲۰۰۹ء
۴۔ آفتاب اصغر۔ تاریخ نویسی فارسی در ہندو پاک۔ خانہ فرہنگ ایران۔ لاہور۔ ۱۹۵۸ء
۵۔ خدابخش خان۔ محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب۔ کتابخانہ خدابخش۔ پٹنہ۔ ۱۹۹۱ء
۶۔ نعمانی، شمس العلماء محمد شبلی۔ شعر العجم۔ اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۶ء
۷۔ عبدالرحمٰن، سید صباح الدین۔ بزم تیموریہ۔ اعظم گڑھ۔ ۱۹۹۱ء
۸۔ طاہر نصر آبادی، میرزا محمد طاہر۔ تذکرہ نصر آبادی، تہران، ۱۳۱۷ش
۹۔ عاشقی، حسین قلی خان عظیم آبادی۔ نشتر عشق۔ اصغر جانفدا۔ نشریات دانش۔ ۱۹۸۱ء
۱۰۔ عبدالرزاق اورنگ آبادی، صمصام الدولہ شاہنواز خان۔ مآثر الامراء۔ ایشیاٹک سوسائٹی۔ کلکتہ۔ ۱۸۹۱ء
۱۱۔ عبدالحمید لاہوری،، ملا۔ پادشاہ نامہ۔ تصحیح کبیر الدین احمد وعبدالرحیم۔ کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء
۱۲۔ کنبوہ لاہوری، محمد صالح عمل صالح موسوم بہ شاہجہاں نامہ، تصحیح دکتر وحید قریشی۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور۔ ۱۹۶۸ء

☆☆☆

طاہرہ وحید عباسی (پروفیسر)
صدر شعبہ فارسی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

عہد اورنگزیب کی ایک علمی شخصیت: شاہ عبدالرحیم دہلوی

شہر دہلی اس بات پر جتنا بھی فخر کرے بجا ہے کہ یہاں عہد اسلامی کے آغاز سے اہل کمال کا مجمع رہا ہے۔ مفسرین، محدثین، متکلمین، فقہا اور دیگر علوم اسلامیہ کے ماہرین کے علاوہ مشائخ اور مجازیب نے اس شہر کو رونق بخشی ہے۔ اس مختصر تحریر میں اس شہر کی نامور شخصیت شاہ عبدالرحیم دہلوی کا تعرف کرایا جا رہا ہے جنہوں نے بذات خود اور ان کے بعد ان کی اولاد و احفاد نے علوم اسلامیہ کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

شاہ عبدالرحیم دہلوی ابن شیخ وجیہ الدین شہید کی ولادت دہلی میں ۱۰۵۴ھ /۴۵-۱۶۴۴ء (۱) میں ہوئی۔ ان کے والد اورنگ زیب کی فوج میں ملازم تھے (۲) ان کے تین فرزند ہوئے: ۱۔ شیخ ابوالرضا محمد، ۲۔ شیخ عبدالحکیم اور ۳۔ شاہ عبدالرحیم۔

شیخ وجیہ الدین کے بیٹوں میں شاہ عبدالرحیم کی طبیعت عہد طفولیت سے دین کی طرف مائل تھی انفاس العارفین کے مطابق:

''صغرسنی ہی میں سر پر پگڑی باندھ کر سر بہ زانو بیٹھتا، وضو میں تمام اعضاء کو پورے طور پر دھوتا اور وضو کی سنتوں کا اہتمام کرتا، میرے ماموں شیخ عبدالحئ جو خود صالح بزرگ تھے، دیکھ کر خوش ہوتے اور فرماتے کے اس کو دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اسلاف کی یہ دولت ہماری نسل میں باقی رہے گی۔ اگر پوتوں کو نہ ملی تو کیا حرج ہے نواسے اس کے حامل و محافظ ہوں گے۔'' (۳)

شاہ صاحب نے ابتدائی کتابیں اپنے برادر بزرگ شیخ ابوالرضا محمد (م ۱۱۰۱ھ) سے پڑھیں اس کے بعد اورنگ زیب کے استاد مرزا زاہد ہروی معروف بہ میر زاہد (م ۱۱۱۱ھ /۱۷۰۰-۱۶۹۹ء) اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحب زادہ خواجہ عبداللہ معروف بہ خواجہ خورد کی شاگردی اختیار کی۔ شاہ صاحب کے اساتذہ ان کے ساتھ خصوصی معاملہ فرماتے تھے، ملفوظات عزیزی کی روایت ہے کہ ایک امیر میر زاہد سے شرح وقایہ پڑھتا تھا وہ اس وقت تک سبق نہیں پڑھاتے تھے جب تک دادا صاحب نہ آ جاتے۔ پوری عبارت اس طرح ہے، ''امیر شرح وقایہ می خواند بے حضور جد بزرگوار سبق نمی فرمود۔'' (۴)

ان کے دوسرے استاد حضرت خواجہ خورد چونکہ ان کے نانا شیخ رفیع الدین کے شاگرد تھے اور ان سے علمی اور روحانی دونوں طرح سے فیض یاب تھے اس لئے وہ بھی ان کے ساتھ شفقت و احترام سے پیش آتے تھے۔

ظاہری تعلیم حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلے حضرت خواجہ سید عبداللہ معروف بہ خواجہ خورد ابن حضرت خواجہ باقی باللہ نقش بندی سے بیعت کی اور ان کے بعد حضرت خواجہ ابوالقاسم اکبر آبادی (م ۱۰۶۴ھ/ ۷۴-۱۶۷۳ء) سے اجازت وخلافت حاصل کی۔ان حضرات کے علاوہ آپ نے زمانہ کے مشائخ کرام اولیاء عظام اور مجازیب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے جس کی تفصیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے انفاس العارفین میں درج کی ہے(۵)۔

شاہ عبدالرحیم صاحب توحید وجودی کا ذوق رکھتے تھے۔شاہ ولی اللہ صاحب کے مطابق:

''والد صاحب شیخ محی الدین ابن عربی کا نام بڑی تعظیم سے لیتے تھے۔فرماتے تھے،اگر میں چاہوں تو ''فصوص الحکم'' کا ممبر پر کھڑے ہوکر بیان کروں اور اس کے تمام مسائل کو آیات اور احادیث کے ساتھ مبرہن کروں اور اس طرح بیان کروں کہ کسی کو شبہ نہ رہے لیکن اسی کے ساتھ وحدت الوجود کی صراحت کرنے سے احتراز کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں اکثر لوگ اس کو سمجھ نہیں سکیں گے اور الحاد وزندقہ کے گڑھے میں گر جائیں گے(۶)۔''

شاہ عبدالرحیم دہلوی ''فتاویٰ عالمگیری'' کے مرتبین میں بھی شامل رہے(۷)۔جس کے نگراں اور صدر شیخ نظام الدین برہان پوری تھے۔سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر نے اس اہم پروجیکٹ پر اس وقت دو لاکھ روپیہ صرف کیا تھا۔جو بلا مبالغہ اس وقت کے کروڑوں روپیہ سے کم نہ ہوں گے۔شاہ عبدالرحیم دہلوی کی اس پروجیکٹ میں شمولیت اور علیحدگی کے سلسلہ میں انفاس العارفین کی روایت اس طرح ہے:

''اس زمانہ میں عالمگیر کو اس کتاب کی ترتیب وتدوین کا بڑا اہتمام تھا ملا نظام الدین (افسر سررشتہ تدوین) روزانہ بادشاہ کے سامنے ایک صفحہ پڑھا کرتے تھے ایکدن انہوں نے وہ حصہ پڑھا جو ملا حامد کے سپرد تھا انہوں نے ایک ہی مسلہ کے متعلق دو کتابوں کی دو متفرق عبارتوں کو جمع کر کے عبارت کو گنجلک کر دیا تھا۔(شاہ عبدالرحیم دہلوی جوان کے دوست بھی تھے) کی نظر جب اس مقام پر پڑی تو اس کی تحقیق کی۔معلوم ہوا کہ دو کتابوں کی مختلف المعنی عبارتیں جمع کر دی ہیں انہوں نے مسودہ کے حاشیہ پر عربی میں یہ عبارت لکھ دی کہ،''من لم یتفقہ فی الدین قد خلط فیہ ھٰذا غلط وصوابہ کذا''یعنی تفقہ فی الدین نہ ہونے کی وجہ سے کاتب سے خلط مبحث ہوگیا ہے صحیح یوں ہے۔''

ملا نظام نے متن کی عبارت کے ساتھ شاہ عبدالرحیم کا حاشیہ بھی پڑھ دیا وہ تو روانی میں پڑھتے گئے لیکن بادشاہ جو پوری توجہ سے سنتے چونک پڑے اور فرمایا ایں عبارت چیست؟ ملا نظام گھبرائے کہ انہوں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔پھر سنبھل کر بولے میں نے اس مقام کا مطالعہ نہیں کیا ہے کل تفصیل سے اس کا مطلب عرض کروں گا۔گھر آئے تو ملا حامد سے شکایت کی کہ میں نے یہ حصہ تمہارے اعتماد پر چھوڑ دیا تھا تمہاری وجہ سے مجھے بادشاہ کے سامنے خفت اٹھانی پڑی۔ملا حامد نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا شاہ صاحب سے اس کی شکایت کی شاہ صاحب نے کتابیں کھول کر ان کو دکھایا کہ عبارت میں خلل اور انتشاہ پیدا ہوگیا ہے۔اس سے بعض معاصرین اور رفقاء کو حسد پیدا ہوا اور شاہ صاحب کچھ عرصہ اس کام میں شریک ہونے کے بعد اس سے علحدہ ہوگئے(۸)۔

شاہ عبدالرحیم دہلوی نے رشد وہدایت کے علاوہ تصنیف وتالیف کی طرف بھی توجہ دی ان کی تصانیف میں متعدد

عربی کتابوں پر حواشی، شیخ تاج سنبھلی کے عربی رسالہ کا فارسی ترجمہ، ملفوظات ومکتوبات کا مجموعہ ''انفاس رحیمیہ'' اور تصوف میں ایک رسالہ بعنوان ارشاد رحیمیہ شامل ہیں۔ ان میں انفاس رحیمیہ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ''انفاس رحیمیہ'' ان کے بیٹے شاہ اہل اللہ نے ترتیب دیا جو مطبع احمدی دہلی میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اس میں دیباچہ اور خاتمہ علاوہ ان کے مکتوبات ہیں دیباچہ میں مضامین تصوف واخلاق پائے جاتے ہیں اور خاتمہ میں ان کے ملفوظات ہیں جن کو شیخ محمد بدرالحق نے جمع کیا ہے۔

''انفاس رحیمیہ'' سادگی اور پرکاری کی عمدہ مثال ہے۔ تصوف سے متعلق امور کو نہایت دلکش عبارت اور عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پیچیدگی اور پرتصنع پیرایہ بیان سے احتراز اور دیگر خصوصیات کی بنا پر ان مکتوبات میں عجیب دل نشینی اور جاذبیت نظر آتی ہے بخوف طوالت چند حوالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

''اے برادر کار عاشق سوز دوام وساز تمام است وشیوۂ معشوق کرشمہ وناز است وطریقۂ عاشق ہمہ عجز ونیاز (۹)۔''

تصوف کی بنیادی تعلیمات کو مختصر جملوں میں اس طرح بیان کیا ہے۔

''الوقت سیف قاطع۔ پس لاچار سعی تمام در حصول آگہی دوام باید کرد کہ سعادت در عبادت است وشقاوت در فراغت (۱۰)۔''

مندرجہ ذیل مکتوب حضرت خواجہ عبداللہ انصاری کا اصلوب وانداز لئے ہوئے ہے۔

''فکر در کاری کن کہ بجز حق کسی را بندہ نشوی وکاری کن کہ فردا شرمندہ نشوی، دنیا سہل است، غافل بودن از حق مطلق جہل امروز کہ دست چوگان است، گولی درمیان است۔ تیز بیانی کے وقت بحران رحمان است (۱۱)۔''

شاہ صاحب کی تصانیف میں ''ارشاد رحیمیہ، در طریق نقشبندیہ'' بھی اس سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کا بنیادی عقائد اذکار اور شجرہ کا بیان ہے۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کے والد شیخ وجیہ الدین جہاد بالسیف کرتے ہوئے میدان کار میں شہید ہوئے تھے لیکن شاہ عبدالرحیم نے جہاد بالسیف پر جہاد بالعلم کو ترجیح دی کہ یہ اس وقت میں امت مسلمہ کی ایک اہم ضرورت تھی۔ شاہ صاحب نے آج سے تقریباً تین صدی قبل چھتہ شیخ نرور میں ایک مدرسہ قائم کیا یہ تاریخی مدرسہ، مدرسہ رحیمیہ تھا اس مدرسہ میں ہندو بیرون ہند سے لوگ حصول علم کہ شوق میں جوق در جوق آنے لگے۔ مدرسہ سے فیض یاب ہوکر نکلنے والوں میں شاہ ولی اللہ، شاہ اہل اللہ، شاہ محمد عاشق پھلتی، فرزندان شاہ ولی اللہ نیز قاضی ثناء اللہ پانی پتی، اخون محمد سعید افغانی اور شاہ نوراللہ بڈھانوی جیسی کئی عظیم المرتبت شخصیات شامل ہیں۔ اس مدرسہ سے نکلنے والے بیشتر علماء وفضلاء نے انگریزی سامراجیت کے خلاف جم کر جنگ کی اور غیر ملکی حکومت کی جڑوں کو کاٹ کر ان کا خاتمہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا امداد صابری ''دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس'' میں رقم طراز ہیں:

''یہ مدرسہ صرف درس گاہ نہیں تھا بلکہ برصغیر کی ایک انقلابی تحریک کا مرکزی ادارہ تھا جس نے پورے ہندوستان میں انگریزی سامراجیت کی جڑیں کمزور کرنے اور ان کا خاتمہ کرنے کے لئے عملی اقدامات کئے تھے (۱۲)''

عہد عالمگیری کے اس عظیم المرتبت صوفی، بلند پایا عالم اور شہر دہلی کے باکمال فرزند نے ۷۷ برس کی عمر پا کر چہار شنبہ ۱۲ صفر ۱۱۳۱ھ کو اس عالم فانی سے دار بقا کا رخ کیا (۱۳)۔ ان کی ایک رباعی پر اس گفتگو کا اختتام ہوتا ہے:

گر تو راہ حق بخواہی اے پسر
خاطر کس راہ مرنجاں الحذر
در طریقت رکن اعظم رحمت است
این چنین فرمودہ آں خیر البشر

حواشی:

(۱) شاہ عبدالرحیم دہلوی کا سال پیدائش بوجود تلاش کے نہیں مل سکا لیکن چونکہ انہوں نے ۷۷ برس کی عمر پا کر ۱۱۳۱ھ میں انتقال کیا اس لئے سن ولادت ۱۰۵۴ھ ہونا چاہئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو انفاس العارفین صفحہ ۸۵۔

(۲) تاریخ دوعت وعزیمت از حضرت مولانا ابوالحسن ندوی جلد ۵ صفحہ ۳۷

(۳) انفاس العارفین صفحہ ۸۵

(۴) ملفوظات عزیزی ص فحہ ۸۲

(۵) تفصیل کے لئے رجوع کریں انفاس العارفین صفحہ ۳۴۔۲۹ بہ عنوان ''ذکر ملاقات حضرت ایشان با سائر اہل اللہ المجاذیب و میزان''۔

(۶) بہ حوالہ تاریخ دعوت وعزیمت از حضرت مولانا ابوالحسن ندوی، جلد ۵، صفحہ ۸۴

(۷) الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند۔ حکیم سید عبدالحئی حسنی، صفحہ ۱۱۱

(۸) انفاس العارفین صفحہ ۲۴۔ دعوت وعزیمت جلد ۵، صفحہ ۸۶۔۸۵

(۹) انفاس رحیمیہ صفحہ ۱۶

(۱۰) انفاس رحیمیہ صفحہ ۱۶

(۱۱) انفاس رحیمیہ صفحہ ۲۰

(۱۲) بحوالہ الواح السناد ید تصنیف مولانا عطاالرحمان قاسمی صفحہ ۴۵

(۱۳) انفاس العارفین صفحہ ۸۵

☆☆☆

میراث خطی

رضوان اللہ آروی (ڈاکٹر)
ڈی ایس جین کالج، آرہ، بہار

حضرت تپاںؔ کا فارسی قصیدہ'' مطلع الانوار ''
تعارف و تجزیہ اور مکمل متن

تصوف و معرفت اور فارسی شاعری میں حضرت محی السالکین مولانا شاہ محمد نورالحق تپاںؔ (۱۱۵۶ھ۔ ۱۲۳۳ھ) کی اہمیت اور قدر و منزلت کا اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ حضرت تاج العارفین پیر مجیب اللہ قادری قدس سرہ[۱] (۱۰۹۸ھ۔۱۱۹۱ھ) جیسے ولی اللہ اور عظیم المرتبت صوفی کے پوتے اور حضرت ابوالحسن فردؔ[۲] (۱۱۹۱ھ۔ ۱۲۶۵ھ) جیسے قادر الکلام شاعر ۔ کہ اہل ایران بھی جن کی شاعری کے معترف تھے۔ کے استاد گرامی تھے۔صاحب '' تذکرۃ الصالحین '' کا بیان ہے کہ۔۔۔'' اس فن (فارسی شاعری) میں آپ (حضرت نورالحق تپاںؔ) کے متعدّد شاگرد تھے جن میں حضرت شاہ ابوالحسن فردؔ قدس سرہ صاحب '' دیوان فردؔ '' سب سے زیادہ ممتاز گذرے ہیں۔۔۔'' (ص ۱۳۹)

آپ کا نام محمد نورالحق اور تپاں تخلص تھا۔آپ کی ولادت باسعادت جمادی الثانی ۱۱۵۶ھ میں ہوئی۔آپ کے والد گرامی حضرت شاہ احمد عبدالحق ابدال قدس سرہ[۳] (۱۱۳۴ھ۔۱۱۹۹ھ) حضرت تاج العارفین پیر مجیبؒ کے بڑے صاحبزادے تھے۔حضرت تپاںؔ کی تعلیم و تربیت جدّ بزرگوار حضرت پیر مجیبؒ اور والد گرامی حضرت شاہ احمد عبدالحق ابدالؒ سے ہوئی۔ بعدازاں حضرت تپاںؔ نے اپنے پھوپھا حضرت ملا وحیدالحق ابدالؒ[۴] (۱۱۲۴ھ۔۱۲۰۰ھ) جو بلاشبہ اپنے وقت کے استاذ الاساتذہ تھے، سے کسب فیض کیا۔حضرت ملا وحیدالحق ابدالؒ نے اپنے اس تلمیذ عزیز کو، اپنے ہی ایک شعر میں ۔'پاک دل، پاک ذات، پاک نہاد' جیسے القاب سے نوازا ہے۔۱۱۷۳ھ میں، رمضان کے مقدس مہینے میں، حضرت تپاںؔ نے اپنے جدّ گرامی حضرت تاج العارفین پیر مجیبؒ کے دست حق پرست پر، سلسلہ قادریہ عمادیہ میں بیعت کی اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس سال یعنی ۱۱۷۳ھ میں حضرت تپاںؔ، سلسلہ قادریہ عمادیہ میں مجاز ہوئے، اسی سال سجادۂ عمادیہ کے زیب سجادہ، حضرت شمس العارفین شاہ غلام نقشبند سجّادؒ[۵] (۱۱۱۶ھ۔۱۱۷۳ھ) کا وصال ہوگیا۔ چنانچہ حضرت تاج العارفینؒ نے حضرت تپاںؔ کو، حضرت محبوب رب العالمین خواجہ عماد الدین قلندرؒ[۶] (۱۰۶۵ھ۔۱۱۲۴ھ) کا خرقۂ مبارک پہنا کر، سجّادۂ عمادیہ پر بٹھایا اور خانقاہ قلندری کو آباد فرمایا۔حضرت تپاںؔ کے استاد گرامی ملا شاہ وحیدالحق ابدالؒ قدس سرہ نے اس موقع پر یہ قطعۂ تاریخ نظم کیا تھا:۔

آن عزیز زمانہ نورالحق پاک دل پاک ذات پاک نہاد
جدّ وہم پیراونشانیدش سر سجّادۂ جناب عماد
سنہ اش زیں دعا بجو کہ ازو خانقاہ قلندری آباد

بعدازاں حضرت تاج العارفینؒ نے شاہ غلام نقشبند سجّادؒ کی دختر یعنی اپنی نواسی بی بی واجدہ سے حضرت تپاںؔ کا نکاح فرمایا۔حضرت تپاںؔ کو اللہ نے فرزند سے نوازا جن کا اسم گرامی شاہ ظہورالحق ظہورؔ[۷] (۱۱۸۵ھ۔۱۲۳۴ھ) تھا۔ وہی آپ کے جانشین ہوئے اور حضرت تپاںؔ نے اپنی حیات ہی میں اپنے فرزند وار جمند کو تمام سلاسل کی اجازت وخلافت سے سرفراز فرما کر سجّادگی پر بٹھایا اور خود گوشہ نشیں ہو گئے۔چار شعبان ۱۲۳۳ھ میں حضرت تپاںؔ کا وصال ہوا اور پھلواری شریف میں حضرت مخدوم شاہ برہان الدین لعل میاں قدس سرہ[۸] (وفات ۱۱۰۷ھ) کے پہلو میں مدفون ہوئے۔آپ کے فرزند و جانشین حضرت شاہ ظہورالحق ظہورؔ نے اس شعر سے آپ کی تاریخ وفات نکالی تھی:ـ

ظہورؔ حزیں گفت سال وفاتت گذشتہ ز جاں نزد جاناں رسیدی

حضرت تپاںؔ، یہ اور بات ہے کہ بحیثیت شاعر زیادہ مشہور ومقبول ہوئے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ نثر میں ان کی فارسی کتاب ''انوارالطّریقہ'' ان کی شاہکار تصنیف ہے جس میں انہوں نے اپنے جدّ امجد کے حوالے سے اپنے اسلاف کا تذکرہ لکھا ہے۔اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ پھلواری کے ممتاز تذکرہ نویس حکیم شاہ شعیب صاحب پھلواروی سمیت، خانوادۂ مجیبی کے تمام تذکرہ نگاروں کے لئے یہی کتاب بنیادی ماٰخذ وحوالہ رہی ہے۔اس کتاب کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ اس میں پہلی بار حضرت امیر عطاء اللہ جعفری زینبی قدس سرہ[۹] (وفات ۹۶۴ھ) کے حالات درج ہوئے ہیں۔چنانچہ اس کی اسی اہمیت وافادیت اور قدر و قیمت کے سبب، حضرت فیاض المسلمین شاہ بدر الدین قدس سرہ[۱۰] (۱۲۶۸ھ۔۱۳۴۳ھ) نے اپنے دست خاص سے حضرت امیر عطاء اللہؒ کے احوال کو اس کتاب سے نقل کیا ہے جو ''احوال امیر عطاء اللہ'' کے نام سے الگ سے ایک مخطوطہ کی شکل میں، خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے۔

حضرت تپاںؔ کو شعر و سخن کا ذوق فطری تھا اور ان کے اس فطری استعداد کو ان کے خسر محترم، حضرت شاہ غلام نقشبندؒ نے مزید نکھارا کہ شاعری میں انہی سے حضرت تپاںؔ کو تلمّذ حاصل تھا۔فن شاعری میں حضرت تپاںؔ کو اس قدر کمال حاصل تھا کہ ایران کے حزیںؔ اصفہانی[۱۱] (۱۱۰۳ھ۔۱۱۸۱ھ) جیسے خود پسند شاعر نے بھی آپ کے کلام کو پسند کیا تھا اور ''کلام خوب است'' کہہ کر داد دی تھی۔فارسی شاعری کے ہر صنف پر آپ کو یکساں قدرت حاصل تھی جس کا ثبوت ان کا ضخیم قلمی دیوان ہے۔غزل، مرثیہ، رباعی اور قصیدہ غرض ہر صنف میں آپ نے داد سخن دی ہے۔خاص طور پر قصیدہ نگاری میں آپ نے فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔اس ذیل میں عرفیؔ شیرازی[۱۲] (وفات ۹۹۹ھ) کی زمینیں حضرت تپاںؔ کو بیحد مرغوب تھیں۔چنانچہ اس کی مختلف زمین میں حضرت تپاںؔ کے قصیدے ملتے ہیں۔مثلاً عرفیؔ کے ایک نعتیہ قصیدے کا مطلع ہے:ـ

اقبال کرم میگزد ارباب ہمم را ہمت نخورد نیشتر لا و نعم را

اس زمین میں حضرت تپاںؔ نے اپنے ایک قصیدے کا آغاز اس مطلع سے کیا ہے:۔

دریا درخ خوب تو بگرفتہ قلم را ہمرنگ خطت ساختم این تازہ رقم را

یہانتک کہ حضرت تپاںؔ کا جو قصیدہ '' مطلع الانوار '' ہماری گفتگو کا موضوع ہے اور جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:۔

مرا کہ پا بگذارم درون ہیچ حصار زشکوہ فلک واختر وزمانہ چہ کار

یہ بھی عرفیؔ کے اس منقبتی قصیدے کی زمین میں ہے جو مولائے کائنات حضرت علیؑ کی مدح میں ہے اور جس کا آغاز اس مطلع سے ہوتا ہے:۔

جہاں بگشتم ودردا بہ ہیچ شہر ودیار نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

حضرت تپاںؔ کے اس قصیدہ '' مطلع الانوار '' کا ایک خوبصورت قلمی نسخہ، خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے جو ۸ر اوراق پر مشتمل ہے۔(H.L. 1949)

خط تعلیق میں اس مخطوطہ کی کتابت ۱۲۰۹ھ میں ہوئی ہے۔ البتہ مخطوطہ میں یہ اطلاع نہیں دی گئی ہے کہ اس نسخہ کی کتابت کہاں ہوئی اور کاتب کون ہے ۔ خدا بخش لائبریری کے توضیحی فہرست نگار (Descriptive Cataloguer) جناب مولوی عبد المقتدر بھی اس مخطوطہ کے بارے کوئی زیادہ معلومات فراہم نہیں کر سکے ہیں۔ یہانتک کہ انہیں یقینی طور اس بات کا بھی علم نہیں کہ شاہ نعمت اللہ قادریؒ کون شخصیت ہیں جن کی مدح میں یہ قصیدہ کہا گیا ہے۔ انہوں نے قیاساً لکھا ہے کہ یہ بات مشکوک لگتی ہے کہ وہ شیخ نعمت اللہ سرھندی قادریؒ [۱۳](وفات ۱۰۱۷ھ) ہونگے جو حضرت میاں میر لاہوری[۱۴] (۹۵۷ھ۔۱۰۴۵ھ) کے مجاز وخلیفہ تھے۔ خان بہادر مولوی عبد المقتدر کے الفاظ یہ ہیں :۔ It is doubtful whether Shah Nimatullah Qadri, in whose praise the Qasida is written,is identical with Shykh Nimatullah Sirhindi Qadri, who was a Khalifa of Miyanmir Lahori." (Descriptive Catalogue of Persian manuscripts.vol.31.Page 208.)

مولوی عبد المقتدر کو یہ اشتباہ، حضرت نور الحق تپاںؔ کے خاندانی پس منظر سے ناواقفیت کی بنا پر ہوا ہے، غالباً۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت تپاںؔ کا یہ قصیدہ ''مطلع الانوار'' حضرت شیخ العالمین شاہ نعمت اللہ قادریؒ[۱۵] (۱۱۶۰ھ۔ ۱۲۴۷ھ) کی مدح میں ہے جو حضرت تاج العارفینؒ کے فرزند ارجمند اور حضرت نور الحق تپاںؔ کے چچا تھے۔ مخطوطہ میں اس کے کئی داخلی شواہد موجود ہیں۔ مثلاً تمہید قصیدہ کے ایک شعر میں، حضرت تپاںؔ نے اپنے ممدوح کو '' عمّ غمخوار'' سے مخاطب کیا ہے:۔

آیم بہ جناب عمّ غمخوار از نالۂ دل بگویم اسرار

اسی طرح قصیدے کے ایک دوسرے شعر میں ممدوح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔'' یعنی شاہ نعمت اللہ قادری مدظلہ العالی۔'' لفظ ''مدظلہ العالی'' سے واضح ہے کہ قصیدہ نگار کے ممدوح ان کے دور میں موجود تھے۔ اور

تیسری سب سے اہم بات یہ کہ اس قصیدے کا عنوان "مطلع الانوار" انہوں نے اسی قصیدہ کے ایک ایسے شعر سے منتخب کیا ہے جس میں حضرت تاج العارفینؒ کے روئے انور کو "مطلع انوار" سے تشبیہ دی گئی ہے: ؎

تو آن نہ کہ بیک آہ جانگداز کسے — بروں زمجلس شیخ الزماں شدی بفرار

کجا تو بودۂ ای سست پی درین حالت — کہ روئی شیخ زماں بود مطلع انوار

مخطوطہ میں، اس شعر کے حاشیہ میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ شیخ زماں سے مراد، حضرت تاج العارفینؒ کی ذات اقدس ہے۔ واضح رہے کہ حضرت مولانا سید وارث رسولنما بنارسیؒ [۱۶] (وفات ۱۱۶۶ھ) نے حضرت تاج العارفینؒ کو مسند شیخ الزمانی پر فائز ہونے کی بشارت دی تھی۔

قصیدہ "مطلع الانوار" ۳؍مطلع، خاتمہ اور دعاء پر مشتمل ہے۔ یہ قصیدہ، علوم قرآن وحدیث کے ساتھ عرفان و تصوف پر بھی، حضرت تپاںؔ کے قدرت ونفوذ کا پتہ دیتا ہے۔ قدرت کلام اور زبان و بیان کی پختگی کی ایسی مثال ان کے خانوادے میں کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ فنّی لحاظ سے اس قصیدہ کی سلاست وروانی کے معترف اہل زبان بھی ہیں شیریں بیانی کے ساتھ شیوا زبانی، حضرت تپاںؔ کے اس قصیدہ کا طرّۂ امتیاز ہے اور شاید اسی وصف و امتیاز کے سبب ان کے معاصرین میں ان کے خلاف رشک وحسد کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا، جن کی طرف تپاںؔ نے اپنے ایک دوسرے قصیدہ میں اشارہ بھی کیا ہے: ؎

رشک آید وخوں از دل حاسد بچکاند — شرحی دہم از فضل وکمال اب وعم را

حضرت تپاںؔ کو اپنے ممدوح سے قلبی عقیدت ومحبت تھی۔ یہی وجہ کہ ان کے فضل وکمال کے ساتھ ان کے دیگر اوصاف معنوی کو بھی تپاںؔ نے عرفیؔ کی طرح مؤثر اور دلپذیر سبک و انداز میں بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے عربی الفاظ و اصطلاحات سے بھی خوب استفادہ کیا ہے جس سے قصیدہ میں وقار پیدا ہوا ہے اور اثر کی شدّت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ قصیدہ ابتک تشنۂ طبع ہے۔ اس کے خطّی نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس خیال سے کہ تاریخی وتہذیبی اہمیت کا حامل یہ قصیدہ اہل علم و ادب کے سامنے آجائے، میں نے اس کا مکمل متن نقل کیا ہے جو ہدیۂ قارئین ہے۔ میرا اساسی نسخہ خدابخش لائبریری میں محفوظ قصیدہ "مطلع الانوار" کا مخطوطہ ہے۔ واضح رہے کہ یہ قصیدہ مکمل صورت میں پہلی بار منظر عام پر آرہا ہے۔

حواشی:۔

۱۔ حضرت تاج العارفین پیر مجیب اللہ قادری قدس سرہ، حضرت مولانا شاہ ظہور اللہؒ کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ کی ولادت با سعادت ۱۰۹۸ھ میں ہوئی۔ آپ کی تعلیم وتربیت، حضرت مخدوم شاہ برہان الدّین لعل میاں قدس سرہ، حضرت عماد الدّین قلندرؒ اور حضرت مولانا سید وارث رسولنما بنارسیؒ جیسے اولیاء اللہ کے زیر سایہ ہوئی۔ حضرت خواجہ عماد الدّین قلندرؒ کے دست مبارک پر سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی اور تمام سلاسل کی اجازت سے سرفراز ہوئے۔ بعد ازاں، حضرت مولانا رسولنماؒ نے بھی آپ کو خرقہ پہنا کر تحریری اجازت نامہ عطا فرمایا۔ آپ کے عہد پاک میں خانقاہ مجیبیہ کو نہایت عروج حاصل ہوا۔ ۱۱۹۱ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ باغ مجیبی میں آپ کا مزار پر انوار مرجع خلائق ہے۔

۲۔ حضرت ابوالحسن فرؔد ابن حضرت شیخ العالمین شاہ نعمت اللہ قادریؒ کی ولادت باسعادت ۱۱۹۱ھ میں ہوئی۔ظاہری تعلیم وتربیت کے بعد آپ نے اپنے والد گرامی کے دست حق پرست پر بیعت کی اور اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔والد گرامی کے وصال کے بعد آپ سجّادۂ مجیبیہ پر فائز ہوئے۔حضرت فرؔد فارسی کے قادر الکلام شاعر ہیں۔آپ کا فارسی کلام دو جلدوں میں طبع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔۱۲۶۵ھ میں آپ کا وصال ہوا اور باغ مجیبی میں مدفون ہوئے۔

۳۔ حضرت تاج العارفینؒ کے بڑے صاحبزادے تھے۔تعلیم وتربیت اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور آپ ہی کے دست مبارک پر بیعت کر کے اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔بعد ازاں، رشد و ہدایت کی غرض سے آپ مرشد آباد (بنگال) تشریف لے گئے۔۱۱۹۹ھ میں مرشد آباد میں ہی آپ کی وفات ہوئی اور اسی شہر کو آپ کی آخری آرامگاہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

۴۔ حضرت ملا وحید الحق ابدال قدس سرہ ابن حضرت ملا وجیہ الحق محدث پھلواروی ۱۱۲۴ھ میں پیدا ہوئے۔درس وتدریس میں آپ کو کمال حاصل تھا۔بے شمار طالبین نے آپ سے استفادہ کیا اور مرتبۂ کمال کو پہنچے۔آپ ریختہ میں نعتیہ شعر بھی کہتے تھے۔۱۲۰۰ھ میں آپ کا وصال ہوا اور باغ مجیبی پھلواری شریف میں آسودہ ہوئے۔

۵۔ حضرت شمس العارفین شاہ غلام نقشبند سجّاد قادری پھلواروی قدس سرہ (۱۱۱۶ھ۔۱۱۷۳ھ) حضرت خواجہ عماد الدین قلندر قدس سرہ کے فرزند اور حضرت تاج العارفینؒ کے داماد تھے۔جبکہ حضرت تپاؔں خود شاہ غلام نقشبند سجّادؒ کے خویش تھے۔آپ کی تعلیم وتربیت حضرت خواجہ عماد الدین قلندرؒ اور حضرت تاج العارفینؒ جیسے صوفیاء کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔۱۱۲۴ھ میں جب آپ کے والد حضرت خواجہ قلندرؒ کا وصال ہوا، اسوقت آپ کی عمر صرف ۸/سال تھی۔لیکن اسی کمسنی میں حضرت تاج العارفینؒ نے آپ کی بیعت لیکر آپ کو سجّادۂ عمادیہ پر بٹھایا۔آپ کا وصال ۱۱۷۳ھ میں ہوا۔

۶۔ حضرت خواجہ عماد الدّین قلندر قدس سرہ (۱۰۶۵ھ۔۱۱۲۴ھ) ابن حضرت شاہ برہان الدّین لعل میاں قدس سرہ نے حصول علم کے لئے دہلی اور لاہور کا سفر کیا۔بعد ازاں سادھورہ پہنچے جہاں حضرت شیر قلندر محمد فاضل سادھوری قدس سرہ کے دست مبارک پر بیعت کر کے اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔۵۹/سال کی عمر میں ۱۱۲۴ھ میں آپ کا وصال ہوا اور اپنے والد گرامی قدس سرہ کے قریب مدفون ہوئے۔

۷۔ شاہ ظہور الحق ظہوؔر (۱۱۸۵ھ۔۱۲۳۴ھ) حضرت تپاؔں کے فرزند تھے اور بعد میں آپ کے جانشین بھی ہوئے۔علوم ظاہری کی تحصیل حضرت تاج العارفینؒ اور اپنے والد ماجد حضرت نور الحق تپاؔں سے کی۔پھلواری شریف کے بزرگوں میں آپ کثیر التّصانیف بزرگ ہوئے ہیں۔'' تذکرۃ الصّالحین '' کے مصنف مولوی حسیب اللہ عظیم آبادی نے آپ کی تصانیف کی تعداد سو تک بتائی ہے، جس میں عربی، فارسی اور اردو کی کتابیں شامل ہیں۔علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ نے اپنے والد حضرت نور الحق تپاؔں کے ہاتھ پر بیعت کی جو بعد میں کنارہ کش ہو گئے اور حضرت ظہوؔر کو سجّادۂ عمادیہ پر بٹھایا۔اس طرح سجّادۂ عمادیہ پر آپ تیسرے جانشین ہوئے۔حضرت ظہوؔر ہی کے دور میں خانقاہ عمادیہ پھلواری شریف سے پٹنہ سیٹی منتقل ہوئی۔۱۲۳۴ھ میں پٹنہ میں آپ کا انتقال ہوا اور آپ پھلواری شریف میں آسودہ ہوئے۔

۸۔ مخدوم برہان الدین، جو عرف عام میں لعل میاں سے مشہور تھے، حضرت بایزید جعفری زینبی پھلواروی کے فرزند اور ملا فصیح الدین جعفری زینبیؒ کے بھائی تھے۔حضرت مخدوم جنید ثانیؒ جیسے بزرگ سے آپ کو ارادت وخلافت حاصل تھی۔حضرت خواجہ عماد الدین قلندرؒ اور حضرت مولانا شاہ ابوتراب آپ کے فرزندان گرامی تھے۔۱۱۰۷ھ میں آپ کی وفات ہوئی اور پھلواری شریف میں مدفون ہوئے۔

۹۔ حضرت امیر عطاء اللہ جعفری زینبیؒ، حضرت شاہ سعد اللہ جعفری زینبیؒ کے فرزند ارجمند تھے۔کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ آپ اپنے والد ماجد کے ساتھ پھلواری شریف تشریف لائے جہاں کچھ دنوں بعد آپ کے والد گرامی کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔اس کے بعد آپ سہسرام تشریف لے گئے جہاں شیر شاہ بادشاہ سے آپ کی ملاقات ہوئی اور اس نے آپ کو منصب وزارت پر فائز کر دیا۔پھر اس کے بیٹے سلیم شاہ نے بھی آپ کو وزارت پر برقرار رکھا۔مگر کچھ عرصہ بعد یہ المناک واقعہ پیش آیا کہ آپ کے فرزند محمد مظفر اچانک رحلت کر گئے۔اس کے بعد آپ دنیا سے کنارہ کش ہو گئے۔ ۹۶۴ھ میں بحالت سفر آپ کا وصال ہوا۔

۱۰۔ حضرت فیاض المسلمین شاہ بدرالدین قدس سرہ ابن مولانا شاہ شرف الدین قدس سرہ، حضرت شاہ علی حبیب نصؔر قدس سرہ کے مرید و خلیفہ تھے۔آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۶۸ھ میں ہوئی۔علم عروض اور فن شاعری میں آپ کو حضرت شاہ وصؔی (جو خود بھی صاحب دیوان شاعر تھے) سے تلمذ تھا۔آپ کے والد گرامی کی وفات کے بعد حضرت نصؔر نے ہی آپ کو سجادۂ جنیدیہ پر بٹھایا۔۱۳۰۹ھ میں آپ کو حضرت نصؔر کا جانشین منتخب کیا گیا اور آپ نے سجادۂ مجیبیہ کو زینت بخشی۔بہار میں جب امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا تو آپ ہی کو امیر شریعت اوّل منتخب کیا گیا۔آپ کی وفات ۷۵ رسال کی عمر میں ۱۳۴۳ھ میں ہوئی اور آپ اپنے شیخ طریقت حضرت نصؔر کے قریب مدفون ہوئے۔آپ کا فارسی کلام '' عطرالوردین '' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

۱۱۔ شیخ علی حزیںؔ کے حالات دیگر تذکروں کے علاوہ خود اس کی کتاب '' تاریخ حزیںؔ '' میں ملتے ہیں، جس میں اس نے خود کو محمد علی فرزند ابی طالب لکھا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ اس کے والد کا نام ابی طالب تھا۔حزیںؔ نے اپنے وقت کے معروف علماء و مشائخ۔جن میں شیخ خلیل اللہ طالقانی اور شیخ بہاء الدین گیلانی شامل ہیں۔سے علم حاصل کیا۔حزیںؔ ایک قادرالکلام اور پُر گو شاعر تھا۔اس کا فارسی کلام چار دیوان پر مشتمل ہے۔اور خود حزیںؔ کے بقول اس کا چوتھا دیوان ۱۱۵۵ھ میں ہندوستان میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔اصفہان پر محمود افغان کے حملوں کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ حزیںؔ کو وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور عراق و حجاز یمن اور بحرین وغیرہ ہوتے ہوئے ۱۱۴۶ھ میں وہ ہندوستان وارد ہوا۔پہلے اس نے لاہور اور دہلی میں قیام کیا۔پھر نادر شاہ کی آمد کی خبر سن کر اس نے لکھنؤ کے راستے بنارس کا رخ کیا۔یہ شہر اس کو اتنا پسند آیا کہ ہمیشہ کے لئے اس نے یہیں سکونت اختیار کر لی۔اسی شہر میں اس نے آخری سانس لی اور یہی شہر آج اس کی آخری آرامگاہ ہے۔ حزیںؔ کا یہ شعر بہت مشہور ہوا:

از بنارس نروم معبد عام است اینجا ہر برہمن پسر لچھمن و رام است اینجا

حزیںؔ کی وفات ۱۱۸۱ھ میں ہوئی۔

۱۲۔ صفوی دور کے معروف شاعر، جمال الدین محمد عرفیؔ کو ہندوستان میں زیادہ شہرت ملی۔حالانکہ اس کی پیدائش شیراز میں ہوئی تھی اور وہیں اس نے تعلیم بھی حاصل کی۔بعد میں اس نے ہندوستان کا رخ کیا اور اکبر کے دربار تک رسائی حاصل کی۔عرفیؔ کی شہرت ایک قصیدہ نگار شاعر کی حیثیت سے ہے۔عرفیؔ کی وفات عالم شباب میں صرف ۳۶ رسال کی عمر میں ہوگئی۔

۱۳۔ حضرت شیخ نعمت اللہ سرہندی قادریؒ، حضرت شیخ میاں میر لاہوریؒ کے بزرگ ترین خلفاء میں تھے۔حضرت میاں میرؒ ایک بار لاہور سے سرہند تشریف لے گئے اور وہاں سخت بیمار پڑ گئے۔اس وقت حضرت شیخ نعمت اللہ سرہندی قادریؒ نے آپ کی بہت خدمت کی جس سے خوش ہو کر آپ نے نہ صرف انہیں بیعت سے سرفراز فرمایا بلکہ ایک ہفتہ کی قلیل مدّت میں انہیں درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔آپ کی وفات جہانگیر کے عہد میں ۱۰۱۷ھ میں ہوئی۔

۱۴۔ حضرت میاں میر لاہوریؒ کے حالات کے لئے دیگر کتابوں کے ساتھ خاص طور پر داراشکوہ کی کتاب '' سکینۃ الاولیاء '' سے رجوع کرنا چاہئے جس میں اس نے نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ حضرت میاں میرؒ کے حالات درج کئے ہیں جو سو (۱۰۰) صفحات سے بھی زیادہ پر مشتمل ہے۔آپ کا نام شیخ محمد میر تھا اور میاں میر عرفیت۔والد کا نام قاضی سائیں دتہ بن قاضی قلندر تھا۔۹۵۷ھ میں شہر سیوستان میں عالم وجود میں آئے۔وہیں علوم متداولہ سے فراغت کے بعد حضرت شیخ خضر سیوستانی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔بعد ازاں آپ لاہور تشریف لائے جہاں آپ کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔یہیں شاہجہاں بادشاہ نے دو بار آپ کی خدمت میں حاضری دی اور دونوں ملاقات میں داراشکوہ بھی موجود تھا، جس کا چشم دید احوال اس نے قلمبند کیا ہے۔شاہجہاں سے پہلے جہانگیر سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی تھی جس کا ذکر اس نے اپنی توزک میں کیا ہے۔ ۱۰۴۵ھ میں شاہجہاں کے عہد میں آپ کا وصال ہوا۔مزار مبارک لاہور میں مرجع خلائق ہے۔

۱۵۔ حضرت مخدوم شاہ نعمت اللہ قادری بن حضرت تاج العارفینؒ کی ولادت باسعادت ۱۱۶۰ھ میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم کے بعد حضرت تاج العارفینؒ نے آپ کو حضرت ملا وحید الحق ابدالؒ کے سپرد کر دیا۔ ۱۱۷۷ھ میں صرف سترہ سال کی عمر میں آپ نے حضرت تاج العارفینؒ کے

دست مبارک پر بیعت کی۔ والد گرامی کی وفات کے بعد آپ ہی ان کے جانشین ہوئے۔ فارسی کے معروف شاعر حضرت ابوالحسن فرد آپ ہی کے فرزند اکبر تھے۔ اور معروف تذکرہ نگار صاحب '' تذکرۃ الکرام '' مولانا شاہ محمد ابوالحیات عجز آپ کے چوتھے فرزند تھے۔ ۸۸/سال کی عمر میں آپ کا وصال ہوا اور باغ مجیبی میں مدفون ہوئے۔

۱۶۔ حضرت تاج العارفینؒ نے سات سال بنارس میں رہکر حضرت مولانا رسولنماؒ سے استفادہ کیا اور علوم شریعت وطریقت کی تکمیل کی۔ مولانا رسولنماؒ کا وصال ۱۱۶۶ھ میں ہوا۔ بنارس میں آپ کا مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔ ہر سال ربیع الثانی میں خانقاہ مجیبیہ کے زیر انتظام آپ کے روضۂ مقدس پر سہ روزہ عرس کا اہتمام ہوتا ہے جس میں کثیر تعداد میں لوگ حاضر ہوتے ہیں اور فیض حاصل کرتے ہیں۔

کتابیات

۱۔ آثار پھلواری شریف موسوم بہ اعیان وطن۔ مولانا حکیم سید شاہ محمد شعیب صاحب نیّر پھلواروی۔ دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف۔

۲۔ سیرت پیر مجیبؒ۔ ہلال احمد قادری پھلواروی۔ دارالاشاعت، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔ ۲۰۰۵ء

۳۔ سجّادہ نشینان بیہار (مشائخ سخن پرداز) سید محمد طلحہ رضوی برق۔ مرکز تحقیقات فارسی۔ رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران۔ دہلی نو۔ ۲۰۱۵ء

۴۔ خزینۃ الاصفیاء۔ مفتی غلام سرور لاہوری۔ مترجمین۔ مفتی محمود عالم ہاشمی وعلامہ اقبال احمد فاروقی۔ مکتبہ جدید پریس، لاہور۔ ۱۴۱۰ء

۵۔ تذکرۃ الکرام۔ مولانا شاہ ابوالحیات قدس سرہ۔ مطبع انوار محمدی

۶۔ سکینۃ الاولیاء۔ محمد داراشکوہ۔ بکوشش دکتر تاراچند وسید محمد رضا جلالی۔ مؤسسہ مطبوعاتی علمی۔

۷۔ تذکرۃ الصالحین۔ مولوی محمد حسیب اللہ صاحب مختار قادری۔ مطبع شمسی گوڑھٹہ، پٹنہ سیٹی۔ ۱۳۴۸ھ

۸۔ تذکرہ اولیائے پاک وہند موسوم بہ مخزنہ التصوف۔ ڈاکٹر ظہور الحسن شارب۔ ناشر، پروگریسیو بکس، اردو بازار، لاہور۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء

۹۔ قند پارسی ویژہ نامہ حزین وبنارس۔ شمارہ ۴۶۔۴۵۔ مرکز تحقیقات فارسی، رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، دہلی نو۔

10- Descriptive Catalogue of Persian manuscripts.vol.31 Compiled by Maulvi Abdul Muqtadir.

(Khan Bahadur) Khuda Bakhsh Oriental Public Library.Patna. 1977 (second edition).

فارسی قصیدہ ''مطلع الانوار'' کا مکمل متن

تمہید قصیدہ مطلع الانوار کہ مخزن تمامی اسرار است

روزی بدلم خیال آمد — نہ بلکہ تمام حال آمد
کی سر فگنم عمامہ از شوق — صد چاک زنم بہ جامہ از شوق
آرم بدو دیدہ خون دل را — گلرنگ کنم رخ خجل را
آیم بہ جناب عمّ غمخوار — از نالہ دل بگویم اسرار
در ضمن مدائح کرامش — گویم غم خویش را تمامش
زین خطرہ سرور در دل آمد — نہ نہ ہمہ نور در دل آمد
در طرح قصیدہ چست جستم — راہ سخن دگر بہ بستم
افگندہ سری بہ پیش دارم — ہم گریہ بحال خویش دارم

قصیدہ مطلع الانوار از نائرہ طہران بی اختیار

مرا کہ پا نگذارم درون ہیچ حصار — ز شکوہ فلک و اختر وزمانہ چہ کار
نہ بر صراط مستقیم ہیئتہ چرخ — نہ قطر و محور او بہر دوش من زنار
زمانہ پیش حقیقت شناس چیزی نیست — کہ تا بہ شکوہٴ او درمیاں نہم گفتار
کنارہ جو ز شمار منجم شب و روز — نظر بہ ہیچ نیارم چہ ثابت و سیّار
بہ وسعت دل من قصر عرش مختصر است — بروشنائی طبعم خور است بی مقدار
مہندسی مشمارم کہ ہر طرف نگراں — نہ بہر شکل عروسم نہ بہر شکل حمار
نہ فلسفی کہ کنم بحث از حدوث و قدم — نہ در حساب کس من نہ کس مرا بہ شمار
بہ شغل صرف چہ تصریف روزگار کنم — بنای ماضی خلق است ست و دور از کار
ز رفع حال بجز انفعال چیزی نیست — کہ دیدن رخ مستقبل است بس دشوار
زنحو یان محقق مگر تو نہ شنیدی — کہ نصب حال شود منخفض ز جرّ جوار
ز منطقی چہ شود نطق من معرّ ف حال — بہ حجتش نہ شود قطع راہ این زنہار
بجز مکابرہ حاصل نبود فہمیدم — ز انعکاس قضا با نتیجہ اسرار
اصول کلیے او رو سیاہ تر ز فروغ — کہ گشت تیرہ ازو راہ رہرو دیندار
نیم فقیہ زمانہ سفیہ تر در خلق — کہ عُجب ذاتی خود را کنم دلیل و وقار
نیم من از متکلّم کہ تا باستدلال — بہ پشت عقل کنم نور معرفت را بار

رہ خدا طلباں ترک ما سواست طہاں
اگر تو مرد رستمی بیا قدم بردار

فغان و نالہ بر آور ز سینہ آتش رنگ
بسوز پاک بیک نعرہ پردہ پندار

چراغ چشم دل از نور عشق روشن کن
بہ بیں در آئینہ حال خویش صورت یار

محیط عالم امکاں منم ز پرتو خویش
چہ مہر و ماہ و چہ اختر چہ شمع در شب تار

ز ستر راز دروں لہجہ ساز چہرہ حسن
زکشف حال بروں رہنمای عاشق زار

اگر بہ نور حقیقت جمال خود نگرم
من آن نیم کہ در آرم فروغ کس بہ شمار

زنم چو خندہ کند برق اقتباس از من
کنم چو گریہ شود مایہ گیر ابر بہار

ز خون تازہ من تازہ روست روی چمن
ز آب دیدہ من سبز دامن کہسار

زمیں ز گریہ نورم غریق بحر محیط
فلک ز شعلہ آہم تمام پر ز شرار

کشادہ روئی من صبح ساز خندہ گل
فراخ دستی من دستگیر برگ چنار

شگفتگی ز نسیم نفس اگر بخشم
گرفتگی کند از طبع غنچہ رو بفراز

حلاوت سخنم مایہ بخش طوطی ہند
غزلسرای من اوستاد صوت ہزار

ز خوش زبانی من خوشہ چیں نشاط تدرو
ز آہ و نالہ من نکتہ سنج بلبل زار

روایے کہ نہادم بپای خامہ خویش
ز پای کبک نیاید بدیں نمط رفتار

نیاز من سبق آموز ناز معشوقاں
گداز من نگہ افزای چشم شمع مزار

ز سینہ صافی من روی آب عبرت گیر
ز شورش دل من موج خیز چشم بحار

ز صبح خیزی من روی ارض غلغلہ سنج
بود ز نالہ شبگیرم آسماں دوّار

ز نورجبہ دل نور بخش صبح منم
بود ز سینہ تابان من فروغ نہار

ز انبساط نشاطم جبین صبح خجل
ز انفعال دل من عرق بروی بہار

ز داغ سینہ من لالہ حظّ وافر یافت
ز آتش دل من سرخ روی گلزار

منم کہ با ہمہ و بی ہمہ ز جملہ قیود
منم کہ پا ز دو عالم کشم درون حصار

بدوش کس نبود بارم از سبکروحی
بخاطری نرسانم ز خاک خویش غبار

ز شور نالہ نریزم نمک بداغ کسی
ز داغ سینہ نہ پیچم درون پنبہ شرار

کنم احاطہ دوراں بیک نگاہ محیط
بسان فکر منجّم دریں خط پر کار

فغانم از نفس غیر ہمچو نے نہ بود
مرا کہ نالہ طبیعی بود چو موسیقار

بحرف شوق اگر خامہ در بناں گیرم
نگار خانہ کنم صفحہ را ز دست نگار

انتقال از بیان حال بہ سوی حکایت تمہید یہ کہ در حقیقت عین مدح ممدوح است

ز قیل و قال مدارس شبی نفور شدم
بہ نفرتی کہ کند طبع از نہیق حمار

خمش نشستم و دریافتم ز طبع سلیم
کہ رفت عمر دریں شیوہ رائگاں بسیار

وگر رود نفس آخرم بہ بیکاری
چہ آید از کف افسوس و دست حسرت کار

سبک بہ جستم و رفتم بہ محفلی کہ دراں
نہ بود جای من و ما نہ پردہ پندار

بساط صحن مقدس حریر خلد بریں ز نور مہر ہدایت چراغ بر دیوار
نشستہ اہل دلاں سر نہاد بر در دل بہ چار سوی بساطش بسان لوح جدار
ترانہ سنج مغنّی بہ لحن داودی خلش بہ سینہ خنک از فغان و نالہ تار
ز شیشہ بادہ منصور در پیالہ بدست ز جوش مستی می نالہ بر لب دل زار
بوجد آمدہ ناگہ ز شوق زیبائی کہ دل ز پرتو اوگشت مشرق انوار (یعنی ممدوح)
چہ گویم از روش او کہ دل بدست او نماند چہ گویم از اثر او کہ برد صبر و قرار
ز جلوہ ہا کہ نمودار بود از ہمہ سو گہی یکی و گہی صد گہی ہزار ہزار
نہال قامت او بر زمیں دل طوبیٰ فروغ طلعت او نور دیدہ ابرار
سر از بزرگی او سرفراز تر ز ہمہ کشیدہ گردن تقویٰ ز فرط عزّ و وقار
کمند زلف رسایش بگردن دل و جاں چناں فتادہ کہ یکدل ازو نکرد فرار
نگاہ کاکل او صید گیر ہر دل و دیں شکنج طرّہ او در شکار بوس و کنار
شمیم جعد مسلسل بہ عنبر افشانی نسیم گیسوئے مشکیں روائح تاتار
ز نقش چین جبینش نشاں ندیدہ کسی گرہ نیامدہ ہرگز بہ ابروئے خمدار
دو چشم میکدہ امّا پراز شراب طہور نگہ مدام ز کیفیت میش سرشار
بہ غمزہ و مژہ درشش جہات تیر انداز ولی نظر بہ سوی ہر جہت گرفتہ قرار
ز نور بینی او روی ارض عالم نور فروغ شمع تجلّی ز پرتو رخسار
لب از تبسّم شیریں شکر فروش جہاں زباں چو قند و دہاں پر ز شربت گفتار
نمک بہ دیدہ خونے دلاں بہ حسن ملیح عرق فشاندہ ز روی لطافت بسیار
زلطف و شفقت ذاتی نہادہ گوش سمیع بہ صوت نالہ عشّاق و نغمہ دل زار
بہ سر عمامہ علم و بدوش چادر حلم ز سینہ صورت دریا ز دست گوہر بار
میان نازک او در سماع بیتابی بسان سنبل پیچیدہ در ہوائی بہار
ز نقش پای شریفش بوقت حالت وجد تمام روی دل و دیدہ بود نرگس زار
بیاض حلہ او در سواد دیدہ من چناں نشست کہ نور نظر بدیدہ تار
بہ جستم از سر دیوانگی بشوق کہ تا ز نقش پای شریفش کنم گل دستار
بگریہ گفتمش ای مایہ سرور دلم بگو بگو کہ چئے و ز کجای از من زار
خرد ز گوشہ مجلس بروں دویدہ بہ خشم نگاہ کرد و بمن گفت ای طپاں ہشدار
نفس بہ سینہ نگہدار و بی ادب مخروش سخن نیوش تو از من ز گوش پنبہ بر آر
تو نام نامی او را نشاں بمن طلبی بمدح او زسر مصرع حرف حرف شمار

مطلع ثانی مشتمل برنام نامی آنحضرت ممدوح درضمن مدح ایشاں

شہ سریر خلافت ملیک ملک وقار امام ملّت و دیں آفتاب شہر و دیار

ہنر فروش و بری ذات پاکش از ہمہ عیب — نگاہ چشم مروّت عزیز در ابصار
علیم علم لدنّی عماد خانہ دیں — مجیب عصر خود از بہر دعوت بسیار
تمام صورت شوق و تمام معجز عشق — امیر اہل دلاں شمع خلوت اسرار
لطیف ذات و مقدس مثال رفع القدس — لبش مسیح وکلامش علاج ہر بیمار
رحیم بر ہمہ خلق و رؤف در اخلاق — یگانہ در ہمہ عالم ز روی عزّ وو قار
مدیح او ز رہ عجز ماندہ سر در پیش — دریں زمانہ نیابی کسی چو او زنہار
ہلاک تیغ عتابش عدو بخاک ذلل — الم بہ سینہ حاسد ز خار راہ فرار
لئیم وقت خوداست لاکہ دررہش دل وجاں — علیٰ یدیہ نباشد برای وقت شمار
امیر وقت خود است لاکہ سرنہد در پاش — لہ ا لو قار لہ العزّ وو ا لعلیٰ ای یار
یکی تو گوش بمن آر ای طپاں بشنو — صریح کردہ ام ازنام پاک اواشعار (یعنی ممدوح)
چمن چمن بشگفتم ز نام نامی او — چنانکہ برگ گل از باد صبح فصل بہار
دلم بجوش در آمد ز مستتر؟ نامش — بہ نالہ بانگ زد بر رخ خرد یکبار
کہ ای ذریعہ دوری و ای وسیلہ بعد — ترا چہ گونہ بر این انجمن شدہ است گذار
ترا چہ حد کہ زنی دم بہ مدحت شاہی — کہ اوج رتبہ اش از پستی تو دارد عار
منم کہ از مدد قوّتش اگر خواہم — بچشم فیل کنم پای پشّہ را مسمار
منم کہ از اثر جوش مستی نگہش — خروش توبہ بر آرم ز سینہ خمار
ز حکم بہر شریفش بہ بزم شاہد و می — منم ز قلقل مینا بر آرم استغفار
منم ز فیض کف او کہ میتوانم ساخت — ز دیدہ ومژہ صد بحر و ابر دریا بار
کجا خیال تو کو من خموش ای مغرور — رمیدہ از دو جہاں با خرد ندارد کار
تو آن نہٰ کہ بیک آہ جانگداز کسی — بروں ز مجلس شیخ ا لزّماں شدی بفرار

تعریض از حکایت تمہیدیہ بحکایت وقوعیہ انتقالیہ حضرت تاج العارفین قدس سرہ

کجا تو بودہٰ ای ست پی درایں حالت — کہ روی شیخ زماں بود مطلع انوار
بہ حجرہٰ کہ ملائک سرود میکردند — خروش نالہ بروں جست از درو دیوار
کہ بود لاکہ نہ زد سر بسنگ بی دل و ہوش — کہ بود لاکہ نینداخت جامہ و دستار
کہ بود لاکہ دلش درحریم سینہ بسوخت — کہ بود لاکہ نمی کردہ نالہ از دل زار
دراں میاں ز سماع کلام .....نے — امام ملّت و دیں در سماع شد یکبار
بوجد آمد و بسپرد جاں بحق کریم — ندید غیر و سوی را بچشم دل زنہار
خروش ماتمش از فرش تا بہ عرش رسید — فغان و نالہ بر آمد ز سینہای فگار

رجوع بہ اصل کلام

بحق صدق و صفایش نکو و راست بگو — کہ سر بسنگ نیامد ترا ہم آخر کار

پس ایں زماں کہ ترا دل بدست نیست چرا
تو غول راہ شدی ای ستمگر خونخوار

برو برو سر خود گیر ای بروں ز دلم
درون حالت بیہوشیم مرا بگذار

کہ بار زو بخطاب آرم از سر ستر ؟
نہم بہ پای نگارین اوسر دستار

نیازنامہ خود را ز مطلع ثا لث
بر آرم از تہ جیب دریدۂ دل زار

بہ عرض حال خود از فرط جوش پنہانی
کنم بہ پیش جناب رفیع او اخبار

مطلع ثالث درشور وشغف وابتہال بجناب مستطاب ممدوح مدظلہ

دہم ز راستی خود عصا بدست جنوں
کنم طواف حریم تو ای شہ مختار

فشانم از عرق انفعال آب کہ تا
سراز خط تو نہ پیچد دریں زمانہ غبار

چہ دولت است اگر آئی شبی بہ کلبۂ من
برنگ نور تجلّی بدیدۂ بیدار

نہم برسم تواضع بہ کفش پای تو سر
بہ شویم از کف پای تو آب دیدہ غبار

بر آرم از دل خوں گشتہ خون تازہ ز شوق
کہ تا کنم کف پای ترا بدیدہ نگار

نہال قد تو در باغ سینہ بنشانم
فدا کنم دل و جاں را بہ پای تو یکبار

بگویم از تو کیم من کہ تا بدانی قدر
بگویم اینکہ چہ ہستی تو تا کنی اقرار

توئی کہ شیفتۂ یک نگاہ مہر تو ام
منم کہ پیش تو ام ہمچو نقش بر دیوار

توئی کہ مثل تو ما را بہ ہیچ عالم نیست
منم کہ ہمچو منت خستہ دل ہزار ہزار

توئی کہ بخشش عام تو عام در عام است
منم ز دیدہ برای تو خاص گوہر بار

توئی کہ مہر جمال تو عالم افروز است
منم بہ پیش تو مانند ذرّہ آئینہ دار

توئی کہ طوطئ نطق تو شکر افشانست
منم بہ کوئ تو مشتاق شربت دیدار

توئی کہ یار شہ ملک و دین و ایمانے
منم بہ پیش تو از آہ دل علم بردار

توئی کہ دل ز کفم بردۂ و پنہانی
منم بہ پای طلب کوچہ گرد شہر و دیار

توئی کہ بادۂ مستی بدست بیداری
منم بہ کوی تو افتادہ از صداع خمار

توئی کہ چاشنی دادی و من بکام تو نیست
منم ز درد تو نالان و بیقرار و فگار

توئی چو قطب فلک در مقام تمکینی
منم بگرد تو سر گشتہ آسماں کردار

توئی کہ چشم تو چوں گل بروی ہر چمنی است
منم ز درد تو مانند غنچہ سر بکنار

جدا ز وصل تو یکدم مرا قراری نیست
بجاست پارہ کنم سینہ گر گریباں وار

بحق صدق و صفایم ای فدا بتو من
بحق جوہر فضل خود ای دُر شہوار

قطعہ

بیا بیا و کرم کن پدیدہ و دل من
ز کمترین غلامان خود مرا بشمار

بحق صحبت دیرینہ ای مدار کرم
بحق عہد قدیم ای خزینۂ اسرار

قطعہ

غبار پای کدورت بروی من مفگن — جمال لطف ومحبت مپوش ازمن زار
بآفتاب طریقت ترا قسم که مرا — بہ ظلمت شب غم اینچنیں نہفتہ مدار
بحق رائ صواب خود ای ہنر پرور — بحق قلب سلیم من ای تمام غبار
روا مدار کہ مانم بدست غیر اسیر — چو گنج عشق تو ہستم مرا بخاک سپار
و لیک تا نفسم در تن است می خواہم — دو دیدہ بر رخ زیبائ تو بماند چار
گہی تو من شوی و گاہ گاہ من ہم تو — تفاوت من و ما از میان ما بر دار
عجب کہ با ہمہ لطف و نوازش و کرمت — حجاب دیدہ شود گرد پردۂ پندار
نرفتہ است ز یاد من آن زمان نشاط — کہ ما دو دیدہ ز یک نور داشتم سروکار
کجا جناب تو کو من خجل ز قول خودم — مگیر حرف من و یک نگاہ لطف بیار
چناں نگاہ کن از لطف ای کریم ا لاصل — کہ اوج من شود اندر دو چشم حاسد خار
دگر ز مشرق طبعم دمید مطلع صبح — کہ جلوہ می دہمش صاف بر رخ اظہار

مطلع ثالث در ثنا گستری ممدوح مدظلہ بر طریق خاتمہ بیان و جملہ دعائیہ

زہی ز روی تو فر خندہ عالم انوار — لب شگفتۂ تو گلفروش صبح بہار
ز حسن خلق تو مسرور ہر شریف و و ضیع — ز لطف عام تو مغرور مفلس و بدکار
ز قوّت تو دماغ جوانی اندر پیر — ز شفقت تو بود طفل خرد دایہ گذار
ز جود عام تو دامان جیب و عالم پُر — ز دست لطف تو دنیا بگوشۂ بُن غار
بود ز رشحۂ کلک تو تازہ روی غنا — درم بہ پیش تو چوں فرد ضایع و بیکار
ز فرط بذل تو گنج زمیں نہاں از ترس — ز پشت دست تو مضروب چہرۂ دینار
گدای کاسۂ فقر تو مالک دیہیم — فدای گوشۂ قصر تو گنبد دوّار
ذلیل کوی تو درشش جہت اذلّ الخلق — عزیز چشم تو در ہر طرف بہ عزّ و وقار
بعید کین تو مردود و رو سیاہ جہاں — قرین قرب تو مقبول خاطر اخیار
سرور سینہ ہر مقبل تو عالمگیر — خلش بہ سینہ حاسد ز سوزن انگار

خاتمہ

زمانہ طور دگر بہر ما چہ انگیزد — کہ ہست طور جمیل تو قاطع ا لاطوار
ز رنگ ماضی و مستقبل است حال تو پُر — خوش است دور جمیل تو جامع ا لادوار
ز فیض عام تو ہر دم دل ہواداراں — چناں پُر است کہ از بوی گل نسیم بہار
ز دخل تیر تو شاہا ہمانم اندر شک — کہ زیر پشت سرین عدو است یا سوفار

دعائیہ

کف دعا چو بر آرم بگو بگو آمین — برای جلب ضریر مرا ای دفع مضار
بزیر چتر فلک شاہی تو تا دم صور — بہ اوج باد و مبارک بہر صغار و کبار

عدو بخاک مذلّت بزیر پای تو باد برنگ سایہ سیہ دود خوار و دور از کار
کسی کہ حاسد جاہ تو ہست تا بہ ابد بود ز اشعۂ نور تو فی عذاب النّار

زنور مدح شریف تو نام نامۂ من
بود بہ مشرق قرطاس مطلع ا لانوار

تمت القصیدہ

تمام ۱۲۰۹ھ

☆☆☆

دکنیات

سید عادل احمد
محکمہ آثار قدیمہ، اسٹیٹ میوزیم، حیدرآباد، تلنگانہ

دارالضرب۔ گولکنڈہ

گولکنڈہ قلعہ کا شمار ہندوستان کے چند ایک قدیم اور مضبوط قلعوں میں ہوتا ہے۔ یہاں کے قلعہ کی ابتدائی تعمیر کے بارے میں بہت ہی قلیل معلومات دستیاب ہیں۔ زیادہ تر مورخین کا خیال ہے کہ یہ قلعہ راجہ کشن داس نے کچی مٹی کی دیواروں پر تعمیر کیا تھا۔ 765ء میں یہ قلعہ ورنگل کے راجہ سری کرشنا دیورائے نے محمد شاہ بہمنی کے حوالہ کیا۔ محمد شاہ بہمنی نے اس قلعہ پر ایک مسجد تعمیر کروائی جس کا نام مسجد محمدی رکھا۔ اس طرح یہ قلعہ محمد نگر کے نام سے مشہور ہوا۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد قطب الملک بانی سلطنت قطب شاہیہ نے قدیم حصاروں کو منہدم کر کے بلند و بالا فصیلیں تعمیر کروائیں۔ قلعہ میں 400 سے زائد برج معہ چبوترے، 8 آہنی بلند دروازے نصب کرائے۔ اس کے علاوہ قلعہ کو ناقابل تسخیر بنانے کے لئے 50 تا 60 فٹ گہری اور بڑی بڑی خندقیں کھدوائیں۔ تمام ضروریات زندگی اس قلعہ میں آراستہ کردی گئیں۔ قطب الملک کے انتقال کے بعد جمشید قلی قطب شاہ جب تخت پر برسر آرا ہوا تو اس نے اپنے نام کے سکے جاری کروائے۔ یہ تمام سکہ جات کی ڈھلائی قلعہ گولکنڈہ کے شاہی دارالضرب میں عمل میں آتی تھی۔ اس کے بعد آنے والے تمام تر حکمرانوں نے اپنے اپنے دور اقتدار میں مختلف دھاتوں کے سکہ جات قلعہ محمد نگر۔ ضرب دارالسلطنت کے نام ڈھلوائے۔ نہ صرف قطب شاہی سلاطین دکن کے سکے جات بلکہ دہلی کے مغل حکمرانوں کے سکہ جات دارالضرب گولکنڈہ سے جاری کئے گئے۔ ان میں شاہجہاں بادشاہ، اورنگ زیب عالمگیر کے سکے جات قابل ذکر ہیں۔ لیکن ہمارے تلنگانہ اسٹیٹ میوزیم میں چاندی کے سکے جات کے دستاویزی کام جاری ہیں جس میں ہمیں چند ایک سکہ جات عالمگیر اور احمد شاہ بادشاہ کے نام سے جاری کئے گئے ہیں، دستیاب ہوئے۔ جن پر رخ ثانی میں دارالضرب گولکنڈہ کندہ ہے۔ ہمارے میوزیم کے علاوہ برٹش میوزم لندن میں ذخیرہ مسکوکات میں بھی اس قسم کے سکہ جات جو گولکنڈہ دارالضرب سے جاری کئے گئے ہیں، موجود ہیں۔ لکھنؤ میوزیم میں بھی چند ایک سکہ جات دارالضرب گولکنڈہ کے پائے جاتے ہیں۔ ہم نے اپنے اس مضمون کے لئے چند ایک تاریخی سکے جات جو دارالضرب گولکنڈہ سے مختلف حکمرانوں کے دور میں جاری کئے گئے ہیں، مختصر تعارف پیش کررہے ہیں۔

قطب شاہان دکن کے دور اقتدار میں بھی چاندی اور سونے کے سکوں پر مغل حکمرانوں کے نام پائے جاتے ہیں۔ ہمارے اس میوزیم کے ذخیرہ میں قطب شاہی سلطنت کے سونے اور چاندی کے سکے جات موجود نہیں ہیں۔ مانا جاتا ہے کہ قطب شاہی دور میں کسی بھی بادشاہ نے سونے اور چاندی کے سکے جاری نہیں کئے۔ صرف تانبہ کے سکے جاری کئے جاتے تھے۔ وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مغل سلطنت کے باج گزار ہونے کے سبب انہیں اس بات اختیار نہیں تھا کہ وہ سونے یا

چاندی کے سکے جاری کر سکتے۔

جمشید قلی قطب شاہ۔ 950ہجری تا957ہجری

تانبہ کے سکہ جات (نمبر1 تا4)

4 سکہ جات میں جن میں 3 تلنگانہ کے ضلع نلگنڈہ اور کریم نگر میں دستیاب ہوئے۔

رخ اول پر سلطان جمشید قطب شاہ کندہ ہے جبکہ رخ ثانی پر دارالضرب محمد نگر گولکنڈہ سنہ موجود ہے۔

سلطان جمشید قطب شاہ ضرب محمد نگر گولکنڈہ سنہ

سبحان قلی قطب شاہ۔ 957ہجری

ایک سکہ جو گولکنڈہ قلعہ میں دستیاب ہوا۔ (نمبر5)

رخ اول پر سلطان سبحان قلی قطب شاہ کندہ ہے جبکہ رخ ثانی پر دارالضرب محمد نگر گولکنڈہ سنہ موجود ہے۔

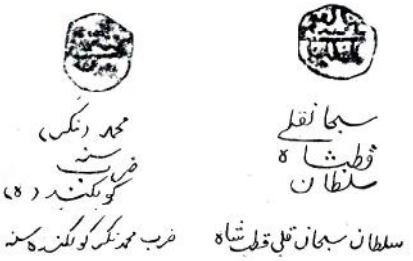

سلطان سبحان قلی قطب شاہ ضرب محمد نگر گولکنڈہ سنہ

ابراہیم قلی قطب شاہ۔ 957ہجری تا988ہجری

اس قطب شاہی بادشاہ کے نام کا کوئی سکہ تا حال دستیاب نہیں ہوا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ۔ 988ہجری تا1020

اس بادشاہ کے نام کے جملہ 50 سکہ جات قلعہ گولکنڈہ اور ضلع نلگنڈہ میں دستیاب ہوئے ہیں۔ رخ اول پر پیوستہ بلغت الٰہی تعیر دہ فلوس شاہی کندہ ہے جبکہ رخ ثانی پر عدل محمد قلی قطب شاہ ضرب دارالسلطنت گولکنڈہ تحریر ہے۔

تمام سکہ جات 4/1348 تا1354 فصلی کے ذخائر میں محفوظ ہیں۔

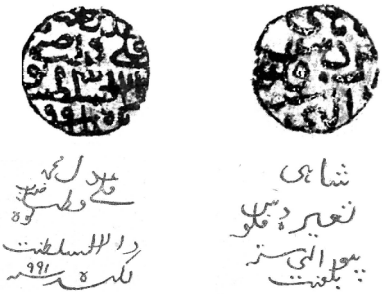

سلطان عبداللہ قطب شاہ۔

عبداللہ قطب شاہ کے دور میں جاری کردہ بے شمار سکے جات ہمارے میوزیم کے ذخیرہ میں موجود ہیں جن پر رخ اول پر سلطان عبداللہ بادشاہ اور رخ ثانی پر ضرب محمد نگر کندہ ہے۔اس کے علاوہ ختم بالخیر وسعادات ضرب دارالسلطنت گولکنڈہ تحریر ہے۔زیادہ تر مورخین نے دارالسلطنت گولکنڈہ سے شاہجہاں کے سکے جاری ہونے کی تصدیق کی ہے تاہم برٹش میوزیم کے کیٹلاگ کے مطابق دارالسلطنت گولکنڈہ سے اورنگ زیب کے سونے اور چاندی کے سکے جاری ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔سونے کے سکے جات کیٹلاگ (صفحہ نمبر 140-139) پر سونے کا سکہ سلسلہ نمبر 708 اور چاندی کے چار سکے نمبر 48,49,51,55 جو دسویں تا اکیس جلوس میں جاری کئے گئے تھے۔یہ تمام سکے دارالسلطنت ضرب گولکنڈہ سے جاری کردہ ہیں۔

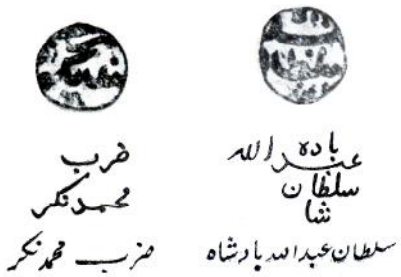

مسکوکات سوسائٹی آف انڈیا کے مطابق کتاب Mint Towns of the Moghul Emperors of India جو 1953 میں شائع کی گئی تھی، صفحہ نمبر 35 پر شاہجہاں کے سونے اور چاندی کے سکے جات دستیاب ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اورنگ زیب عالمگیر اور احمد شاہ کے سونے و چاندی کے سکے جات جو دارالضرب گولکنڈہ سے جاری کئے گئے تھے، صفحہ نمبر 36 پر درج ہیں۔اس کتاب کو سی آر سنگھل نے 1953 میں تحریر کیا تھا۔عالمگیر کے سکے جات جو ہمارے میوزیم کے ذخیرہ میں موجود ہیں، 17/1342 فصلی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی زد چو بدر منیر سکہ در جہاں ہے۔سنہ 22 جلوس میمنت مانوس ضرب گولکنڈہ کندہ ہے۔احمد شاہ 67-1161 کے سکوں پر رخ اول بفضل الہ عالم پناہ

سکہ در جہان اور رخ ثانی پر سنہ جلوس میمنت مانوس ضرب گولکنڈہ کندہ ہے۔ بالکل اسی طرح کے سکہ جات پنجاب میوزیم کے کیٹلاگ کے صفحہ نمبر 359 اور پلیٹ 13 پر بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ سکوں کے عکس درج ذیل ہیں:۔

4156/F/1323-1339

4157/F/1323-1339

4158/F/1323-1339

4159/F/1323-1339

4160/F/1323-1339

4161/F/1323-1339

4163/F/1323-1339

آئینۂ تحقیق

لطیف احمد سلمانی
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پایان نامۂ شعبۂ فارسی، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

(الف) پایان نامۂ دکتری

شمار	عنوانِ مقالہ	مقالہ نگار	نگران	سن
۱۔	کشمیر میں شہمیری دور کے فارسی ادب کا تنقیدی جائزہ	جی.ایم.مرغوب	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۷۷
۲۔	شرح حیات وآثار صرفیؒ کشمیری	غلام رسول جان	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۸۱
۳۔	خواجہ حبیب اللہ جی کشمیری شرح زندگی عرفان اور دیوان ۔۔	سید امین قادری	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۸۱
۴۔	کشمیر میں اکبر اور جہانگیر کے دور کا فارسی ادب	محمد صدیق نیاز مند	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۸۴
۵۔	چک دور میں کشمیر کا فارسی ادب	سیدہ رقیہ	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۸۴
۶۔	کشمیر میں فارسی مثنوی نویسی کا ارتقاء	محمد یوسف لون	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۸۷
۷۔	افغان دور میں کشمیر کے فارسی ادب کی تاریخ	محمد منور مسعودی	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۸۷
۸۔	کشمیر میں شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے دور کا فارسی ادب	الفت جان	ڈاکٹر محمد صدیق نیاز مند	۱۹۹۲
۹۔	ایران میں فارسی ناول کا تنقیدی مطالعہ	بشیر احمد	ڈاکٹر محمد صدیق نیاز مند	۱۹۹۲
۱۰۔	کشمیر میں فارسی تذکرہ نویسی	رفیقہ میر	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۹۲
۱۱۔	مغازالنبیؐ از مولانا شیخ یعقوب صرفیؒ	الطاف احمد وانی	ڈاکٹر جی.آر.جان	۱۹۹۵
۱۲۔	کشمیر میں فارسی صوفی ادب کا جائزہ	محمد مقبول صوفی	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۹۵
۱۳۔	کشمیر میں عہد حاضر کا فارسی ادب	ظہور احمد ڈار	ڈاکٹر غلام رسول جان	۱۹۹۷
۱۴۔	فارسی مثنوی کے کشمیری پر اثرات	محمد عبداللہ گنائی	ڈاکٹر محمد منور مسعودی	۱۹۹۹
۱۵۔	کشمیر میں تاریخ نویسی کے ذریعہ سے فارسی زبان ۔۔۔۔۔	ثناءاللہ شاہ	ڈاکٹر محمد منور مسعودی	۱۹۹۹
۱۶۔	جدید فارسی شاعری: اس کا ارتقا اور عصری شعور	محمد شفیق خان	پروفیسر شمس الدین احمد	۲۰۰۱
۱۷۔	شہنامہ کشمیر	نیلوفر ناز نحوی	ڈاکٹر محمد منور مسعودی	۲۰۰۵
۱۸۔	محمد اسلم سالم	تبسم جبین	ڈاکٹر سیدہ رقیہ	۲۰۰۸
۱۹۔	تحقیق وتدوین دیوان ملا ساطع	مسرت پروین	ڈاکٹر زبیدہ جان	۲۰۱۲
۲۰۔	تاریخ زبان وادبیات فارسی در ناحیۂ جامو	سید ابراہیم رضوی	پروفیسر محمد منور مسعودی	۲۰۱۴

(ب) پایان نامۂ پیش دکتری

شمار	عنوان مقالہ	مقالہ نگار	نگران	سن
۱۔	دوسری جنگ عظیم کے بعد کی ایرانی فارسی شاعری کا تجزیہ	رخسانہ جبین	ڈاکٹر آصف نعیم صدیقی	۱۹۷۹
۲۔	جہانگیر کے عہد میں کشمیر کا فارسی ادب	محبوبہ منصور	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۸۲
۳۔	افغان دور میں کشمیر کا فارسی ادب	محمد منور مسعودی	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۸۳
۴۔	فارسی ادب بعد اورنگ زیب در کشمیر	محمد مقبول صوفی	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۸۵
۵۔	کشمیر سکھ دور کا فارسی ادب	بشیر احمد وانی	ڈاکٹر محمد صدیق نیاز مند	۱۹۸۶
۶۔	حضرت بابا داؤد خا کی شرح احوال و آثار اور ان کی شاعری	مزمل جان	ڈاکٹر محمد صدیق نیاز مند	۱۹۸۶
۷۔	عہد مشروطیت کی فارسی شاعری ایک سماجی مطالعہ	شاہین نزہت	ڈاکٹر آصف نعیم صدیقی	۱۹۸۶
۸۔	ایران میں اسلامی انقلاب کا فارسی ادب ایک جائزہ اور تبصرہ	بشیر احمد	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۸۶
۹۔	ڈوگرہ دور کا فارسی ادب	الفت جان	ڈاکٹر سید محمد امین قادری	۱۹۸۶
۱۰۔	غنی کشمیری، زندگی اور شاعری	نیلوفر ناز نحوی	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۸۷
۱۱۔	کشمیر میں فارسی مثنوی نویسی کا ارتقا	محمد یوسف لون	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۸۷
۱۲۔	بابا علی رینہ شرح احوال و آثار	رفیقہ میر	پروفیسر شمس الدین احمد	۱۹۸۷
۱۳۔	مولانا مبارک شاہ فطرت احوال و آثار	ظہور احمد ڈار	ڈاکٹر جی۔آر۔جان	۱۹۹۲
۱۴۔	میر سید اللہ شاہ آبادی کی زندگی اور شاعری	محمد عبداللہ گنائی	ڈاکٹر محمد منور مسعودی	۱۹۹۲
۱۵۔	کشمیر میں افغان دور کا فارسی نثر و ادب	الطاف احمد وانی	ڈاکٹر محمد منور مسعودی	۱۹۹۲
۱۶۔	مرزا عبدالرسول استغنا کشمیری	محمد رجب بٹ	ڈاکٹر عمر صدیق نیاز مند	۱۹۹۲
۱۷۔	کشمیر کے فارسی ادب کے ارتقاء میں حضرت بابا داؤد مشکوتی۔	تسنیمہ جان	ڈاکٹر عمر صدیق نیاز مند	۱۹۹۸
۱۸۔	ملا محمد اشرف دایری بلبل کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ	محمد حسین ملک	ڈاکٹر جی۔آر۔جان	۱۹۹۸
۱۹۔	حضرت بابا نصیب الدین غازی بحیثیت ادبی شخصیت وفن	عبدالحمید ماگرے	ڈاکٹر محمد منور مسعودی	۲۰۰۰
۲۰۔	جموں خطے میں دستیاب فارسی آثار کا ایک جائزہ	سید ابراہیم رضوی	ڈاکٹر محمد منور مسعودی	۲۰۰۲
۲۱۔	حضرت ملا محمد طیب آخون کی شخصیت وفن کا تنقیدی مطالعہ	محمد محمود	ڈاکٹر محمد صدیق نیاز مند	۲۰۰۳
۲۲۔	وجیز التواریخ کا تنقیدی مطالعہ	نذیر حسین کھٹانہ	ڈاکٹر محمد صدیق نیاز مند	۲۰۰۴
۲۳۔	احوال و آثار میر الٰہی ہمدانی	شاداب ارشد میر	ڈاکٹر محمد صدیق نیاز مند	۲۰۰۸
۲۴۔	شعرای قصیدہ گوئی فارسی در کشمیر	جاوید احمد ملا	ڈاکٹر محمد یوسف لون	۲۰۱۴
۲۵۔	شرح احوال و آثار ملا محمد حسین خباز	فاروق احمد وانی	ڈاکٹر جہانگیر اقبال	۲۰۱۴

(نوٹ) راقم نے اُن ہی پایان ناموں کی فہرست تیار کی ہے جو کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے تھیسس سیکشن میں موجود ہیں اور اُن کا ایک باقاعدہ رجسٹر بنا ہوا ہے۔☆☆☆

چشم بینش

احمد نوید یاسر ازلان حیدر
مدیر

حیات سعدی (تحشیہ وتعلیقات: سید محمد اسد علی خورشید): ایک تعارف

جب کوئی احساس دل کی گہرائیوں سے نکل کر شمشیر قلم کے زور سے قلعۂ قرطاس کو تسخیر کرتا ہے تو اس سے نکلنے والا رنگ خونی ہونے کے بجائے پر کیف اور دل و دماغ کو مسرت بخشنے والا ہوتا ہے، چاہے وہ شاعر ہو یا ادیب، کہانی کار ہو داستان نگار ایسے تخلیق کاروں کی تخلیقات میں احساسات کی وہ آمیزش ہوتی ہے جو نہ کہ صرف قارئین کے دلوں کو چھو جاتی ہے بلکہ ان کی دھڑکنوں کو نغمگی بخشنے میں بھی بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ فارسی شعر ادب کی اگر بات کی جائے تو شاید اللہ رب العزت نے اس زبان و ادب کی آبیاری آب حیات سے کی تھی یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں اس زبان نے ایسے ایسے فنکار پیدا کئے کہ جن کی تخلیقات سے نہ صرف زبان و ادب فارسی ہی سیراب ہوا بلکہ تمام ادبیات کے لئے وہ تخلیقات مشعل راہ بن گئیں۔ ایسے ہی تخلیق کاروں میں ایک نام مصلح الدین سعدی شیرازی کا بھی ہے جن کا نام اور شخصیت صرف علماء ہی نہیں بلکہ عوام کے لئے بھی تعریف و تعرف کا محتاج نہیں۔ سعدیؔ شیرازی نے فارسی شاعری کو تغزل اور فکر کی وہ راہ عطا کی جس آگے چل کر حافظ شیرازی نے اسی شاعری کو اوج ثریا تک پہنچا دیا، اسی وجہ سے سعدیؔ کو فارسی غزل کا پیغمبر بھی کہا جاتا ہے۔ شاعری کے علاوہ سعدی کے معرکۃ الآراء کارناموں میں گلستان و بوستان ہیں جو سعدی کے عہد سے لیکر عہد وسطیٰ تک مدارس میں اولین درس میں شامل رہی ہیں اور آج بھی اپنی اہمیت اور افادیت کا لوہا منوا رہی ہیں۔ لیکن افسوس کہ انیسویں صدی تک ایسی بلند اقبال ہستی پر کوئی تحقیقی تصنیف نہ لکھی جا سکی۔ انیسویں صدی کے بے مثل عالم، بے بدل ادیب، طوطی مقال شاعر اور ماہر سوانح نگار مولانا الطاف حسین حالی نے پہلی بار سعدی شیرازی پر تحقیقی و تنقیدی تصنیف ''حیات سعدی'' لکھی اس بات کا اعتراف ایرانی اور انگریز محققین نے بھی کیا ہے کہ ''حیات سعدی'' سعدی شیرازی پر کسی بھی زبان میں لکھی گئی پہلی باضابطہ تصنیف ہے۔ اس کتاب کے سن تالیف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت و شہرت کا یہ عالم تھا کہ حالی کی زندگی میں ہی اس تصنیف کے دس بارہ ایڈیشن شائع ہو چکے تھے اس کے بارے میں حالی خود کہتے ہیں:

''پھر دلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام حیات سعدی ہے اور جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ (حیات سعدی۔ مطبوعہ دار المصنفین۔ ص iii بحوالہ مسدس حالی)''

کئی مطابع سے شائع ہونے کی وجہ سے یا مرتبین کی کوتاہیوں کی وجہ سے ان ایڈیشنوں میں شاید کچھ خامیاں بھی

درآئی تھیں جس کی وجہ اسماعیل پانی پتی نے بڑی محنت و کاوش سے اسکا پہلا ایڈیشن حاصل کر کے جو کہ خود مولانا حالی نے شائع کروایا تھا دوبارہ اسے مرتب کر کے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا اور تب سے آج تک اسی نسخے کے ایڈیشن معتبر مانے جاتے ہیں اور یہ تصنیف آج بھی مسلسل شائع ہو رہی ہے۔

مولانا حالی نے وہ زمانہ پایا تھا جہاں ایک بڑا طبقہ فارسی داں بھی اور اردو زبان کا بھی عروج کا دور تھا، حیات سعدی کی زبان ان کے عہد کے علمی و ادبی ماحول کی عکاس نظر آتی ہے، مگر کسی بھی تحقیق کو کبھی تکمیل کی سند نہیں دی جا سکتی، تحقیق کا باب ہمیشہ وا رہتا ہے۔ مولانا حالی نے سعدی اور سعدی کی تخلیقات کے ساتھ خود بھی بہت ایسے الفاظ لکھے ہیں جن کے لئے حواشی کی ضرورت پڑتی ہے، ''حیات سعدی'' جو کہ سعدی کی حیات کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف کا بھی احاطہ کرتی ہے اس میں ہر سطر میں ایسے الفاظ اور صفحہ پر ایسے اشعار اور ایسی اصطلاحیں موجود ہیں جو کہ خود ایک الگ تحقیق کا موضوع ہیں۔ اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے دارالمصنفین شبلی اکیڈمی نے اس کے متن کو دوبارہ مرتب کر کے مع حاشیہ اور تعلیقات شائع کروایا۔

موجودہ نسخہ جس پر حاشیہ اور تعلیقات کا التزام فاضل استاد پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، صدر شعبۂ فارسی، دانشگاہ اسلامی، علی گڑھ نے کیا ہے، حیات سعدی کا یہ ایڈیشن تقطیع پر رنگین کور اور اچھے کاغذ کے ساتھ ۳۱۲ صفحات میں جنوری ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کی جو سب سے خاص بات نظر آئی وہ یہ کہ حاشیہ نگار نے بڑی تحقیق و جستجو سے ہر اس لفظ، ہر اس شعر اور ہر اس محاورہ کی تشریح کر دی جن کے معنی کا حصول قاری کے لئے اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا۔ ایڈیشن میں حاشیہ کے اس التزام کے ساتھ ایک اور بات یہ قابل ذکر نظر آئی ہے کہ حالؔی کے ذریعہ رقم کئے حواشی کے ساتھ حاشیہ قدیم لکھ دیا گیا ہے تا کہ حالؔی کی تحقیق اور موجودہ تحقیق میں فرق واضح ہو جائے۔ اسی طرح فہرست اسمائے اشخاص، اسمائے کتب، اسمائے اماکن کے ساتھ مصادر محشی کی فہرست بھی درج ہے جس سے جہاں ایک طرف یہ واضح ہوتا ہے کہ محشی نے کتنی دقیق نظری اور کتنی عرق ریزی سے اس کام کو انجام دیا ہے وہی یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ محشی نے اسماعیل پانی پتی کی کوشش سے مرتب ہوئے نسخے (مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء) کے ساتھ ساتھ حیات سعدی کے لاہور ایڈیشن (۱۸۸۸ء)، آگرہ ایڈیشن اور نئی دہلی (۲۰۱۱ء) ایڈیشن سے بھی استفادہ کیا ہے، اور ان ایڈیشنز کے علاوہ بھی کئی ایڈیشن زیر نظر رکھے ہیں۔

''حیات سعدی'' کے اس ایڈیشن کے انکور کے بعد علامہ شبلی کے ان اقوال کو بعنوان ''حیات سعدی: شبلی کی نگاہ میں'' یکجا کر کے ایک پیج میں شامل تصنیف کیا گیا جو انہوں نے اس تصنیف کے متعلق کہے تھے۔ اس کے بعد پروفیسر اشتیاق احمد ظلی ڈائریکٹر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا پر مغز مقدمہ اور اس کے بعد پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید (محشی) کی تحریر بعنوان سرگزشت حیات سعدی شامل تصنیف ہے اس سرگذشت میں موصوف نے حیات سعدی کی اہمیت و افادیت پر سیر حاصل بحث کرنے کے ساتھ ساتھ سعدی کی شخصیت ان کے آثار اور ''حیات سعدی'' کے بارے میں ایرانی اور غیر ایرانی تمام محققین کی آراء پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور ساتھ ہی اس نکتہ پر بھی ضمناً گفتگو کی ہے کہ ''حیات سعدی'' پر اس طرح

کے کام کی ضرورت کیونکر پیش آئی۔ موصوف کی شخصیت حلقہ اساتذہ فارسی واردو میں کسی تعریف وتعرف کی محتاج نہیں ان کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ خود بھی فارسی زبان کے بے طوطی مقال شاعر ہیں اور اس امر کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے حج کے سفر کی روداد منظوم بزبان فارسی ''سفر سعادت حرمین شریفین'' کے نام سے رقم کی ہے۔ اس طرح حیات سعدی کے اس ایڈیشن کے ساتھ شاعری کی ایک روایت کچھ یوں پوری ہوتی نظر آتی ہے کہ سعدیؔ شیرازی جیسے آفاقی شاعر پر پہلا تحقیق کام حالیؔ جیسے اصلاحی شاعر نے کیا اور اب اس پر حواشی کا التزام پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید جیسے اخلاقی شاعر نے انجام دیا۔ میں بارگاہ ایزدی میں دعا گو ہوں کہ وہ استاد گرامی کو ایسے اور بھی گراں مایہ کارنامے انجام دینے کے لئے صحت اور ہمت عطا کرے اور دارالمصنفین کو اتنے بڑے ادبی کارنامے کے لئے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ (آمین)

☆☆☆

S. No.: 7 ISSN- 2394-5567

DABEER

(An International Peer Reviewed Refereed Quaterly Literary Research Journal For Persian Literature)

VOLUME:- III **ISSUE:- II**

April to June 2016

Editor:
Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Address:
Dabeer Hasan Memorial Library ,12, Choudhari, Mohalla, Kakori, Lucknow, U.P., India-226101
Email:- **dabeerpersian@rediffmail.com**
Mob. no:- 09410478973

Founder:- **Professsor Umar Kamaluddin Kakorvi,** LU, Lucknow.

Chief Supervisor:- **Dr. S. M. Asghar Abidi**, AMU, Aligarh.

Supervisor:- **Dr. Anjuman Bano Siddiqui,** Lucknow.

Editorial Board

Professor Syed Hasan Abbas, BHU,

Professor S M A Khursheed, AMU,

Professor Aleem Asharaf Khan, DU,

Dr. Shahid Naukhez Azmi, MANUU,

Dr. Muhammad Aqeel, Persian, BHU,

Dr. Muhammad Qamar Alam, AMU,

Zunnoorain Haider Alavi, Editor

Bi-Annual **TASFIYA**, Kakori, Lucknow.

Naqi Abbas Kaifi, Editor

Quaterly **NAQD-O-TAHQEEQ**, Delhi.

Arman Ahmad, Editor

Quaterly **IRFAN**, Chapra, Bihar.

Co-Editors

Mohammad tauseef, AMU, Aligarh

Atifa Jamal, Lucknow

Munazir Haque, AMU, Aligarh

Muhammad Hasan, AMU.

Muhammahd Anash, AMU, Aligarh

Sarim Abbas, AMU, Aligarh

Asharf Ali, AMU, Aligarh

Rajesh Sarkar, BHU, Varanasi

Mohammad Jafar, JNU, Delhi

Saduddeen, AMU, Aligarh

Review Comiitee

Professor Azarmi Dukht Safavi,

Director IPR, AMU, ALigarh.

Professor Shareef Hussain Qasmi,, Ex-Dean,

F/0 Arts, DU, Delhi,

Professor Mohammad Iqbal Shahid , Dean

F/o Laguages Islamic & Ori. Lear. , GCU, L.

Prof. Abu Musa Muhammad Arif Billah,

Al Biruni Faundation, Dhaka.

Professor Abdul Qadir Jafery,

HOD Arbic & Persian, A. University.

Dr. Najm ul Rasheed, Persian,

Punjab University, Lahore.

Advisory Board

Professor Ziyauddin Ahmad Shakeb Kakorvi,

Professor Panna Lal, HOD History,AU

Professor Ram Sumer Yadav, Lucknow

Professor Musheer Hussain Siddiqui, LU

Dr. Gulfihsa Khan, AMU

Dr, Ata Khursheed, MA Liberary, AMU

Dr. Pradeep Jain, Allahabad.

Dr.(Ms.) Berna Karagözoglu, Agri Ibrahim

Çeçen University, Turkey.

Dr. Iftikhar Ahmad, M A College, Colcata.

Dr. Alam Azmi, KMCUAFU, Lucknow.

Dr. Arshad Qadiri, Lucknow University,

Dr. Sakina Khan, HOD Persian, MU,

Dr. Shahram Sarmadi, Tehran, Iran.

Dr. Prashant Keshavmurthy, Macgill Univ.

Inci Celikel, Anatoliya Univerity, Turky.

Zafar Iftekhar (Dr.)
Guest Teacher‹Department of Sanskrit, AMU, Aligarh

Assessment of Hindi and Sanskrit Litrature

Sanskrit is one of the oldest classical languages in the world that was originated, developed and nourished by people living in the eastern side of the river Shindhu, known as Hindus or Indians. Sanskrit has the unique feature of being one of the few heritage languages with no geographical or dynastic tag attached to its name. Meaning of the term Sanskrit envelopes a number of attributes like pure, refined, decorated, educated, respected, beautiful, polished and elegant. The holy books of all the Indic religions like Hinduism, Buddhism, Jainism, Vaishnavism and Sikhism are written in Sanskrit language. Structure and form of all the Indian languages find their roots in Sanskrit. This is not without reason that Sanskrit is considered as the mother of all the Indian languages.

Hindi is one of the widely used languages in India, and has tremendous social and political impact emanating from its wide use by politicians, film makers, dramatist and musicians. Hindi was once a strong medium used by Indian national leaders for spreading the call for independence of India from the British rule. It is the official language of the Union of India. Although Sanskrit is the mother of many Indian languages including Hindi and there are many similarities between Sanskrit and Hindi as regards scripts, words and pronunciation, a number of dissimilarities and differences too do exist between the two. This article attempts to highlight some of the more important differences between the two Indian languages.

According to Hindu mythology, Brahma, referred to as grandfather introduced the language as medium of worship, for composing music for entertainment of God and Goddesses and writing literature in praise of the creator of universe. This is the reason that Sanskrit is called Dev Bhasha (language of God). During the middle of 18th century the world started to take interest in Sanskrit due to the discovery by famous historian Max Muller, of

some of the greatest scientific and mathematical formula, experiment, research, analysis and results in the supposedly oldest books in the world like, Veda and Purana written in Sanskrit. Going deep into the form and structure of the language would also make one astonished by the resemblance of the language with other lesser old heritage languages of the world namely Greek and Latin. It is believed that the available written oldest Sanskrit literature dates back to 2000 BC. Two of the greatest epics of the world, Ramayana and Mahabharata were written in Sanskrit. The Hindu rulers of India especially those belonging to Maurya, Sen and Kusha dynasties actively encouraged and patronized the great Sanskrit poets and dramatists for quite a long time. Even the Mughal emperors who ruled India during the last leg of Islamic rule, used to honor Sanskrit scholars as a part of their administrative policy.

Hindi or standard Hindi or high grammar Hindi is the language of people living in Delhi, Uttar Pradesh, Uttar Khand and other parts in Northern India. The dialect of Hindi also Known as Hindustani language started to be used as language for administrative purposes during 1600 AD in India. During that period Hindi did not have any recognition as separate language and was treated as part of Urdu language. From the first half of 19th century a pro-Hindi movement came-up ending in official recognition of Hindi as a separate language.

Sanskrit has a very complex system of grammar and composition structure comparable only with Greek and Latin and to some extent with German. Correct pronunciation is of supreme importance so long as Sanskrit is concerned, and slightest of deviation is strict no-no in Sanskrit. Hindi, on the other hand, is much easier in its grammar and composition structures with simple words and lesser importance attached to pronunciation.So far as literary work is considered Sanskrit is considered the richest in the world. Three greatest Political, Social and Romantic epics namely, Mahabharata, Ramayana and Abhigyan Shakuntalam are written in Sanskrit. Some of the Sanskrit Slokas give tremendous importance on musical notes attached to them which create an ambience of highest level of devotion and proven to be having psychological therapeutic values. Some of the great ancient research works on Finance, Economics, Political-science, Sociology, Ethics and

Human love & Sexuality were done in Sanskrit and considered to be highly relevant even today. Kautilya's Artha Shastra (collection of Economic theories), Chanakya's Rashtra Niti (Political theories) Ramanujam's Ganita Shastra (theory and explanation of Geometry and Arithmetic) and Batsayan's Kama Shastra (Synthesis of art and sexuality) are some of the piece of works written in Sanskrit revered till today by world scholars in their respective fields. But no Hindi novel has so far been able to stand up to be even compared with any of the Sanskrit novels and dramas written more than 1500 years from now.

The period between 17th and 20th century is known as golden period for Hindustani music. Most of the highly revered classical songs were composed in Hindi with relevant variations among the Hindi siblings like Maithili, Bhojpuri etc. Tansen, the great classical singer in the court of the Mughal emperor Akbar used to speak and sing in Hindi. Historical evidences show that Sanskrit in its pure and original form was used by royal families, Acharya Brahmins, priests, pundits (educated) and rich traders. Sanskrit in the form as used by the above mentioned people was not meant for use of common people. They used lesser pure version of Sanskrit known as Pali. During the onslaught of Muslim invaders, Hindu reformists and saints effectively used Sanskrit to counter the invasion of Islamic culture and language. Sri Chaitanya Mahaprabhu, Shankaracharya and Swami Vivekananda the famous Hindu Saints effectively used Sanskrit to spread the message of Hinduism across the world. During Indian independence movement, many revolutionary leaders of India took help of Sanskrit to infuse Hindu pride to ignite patriotism among the youth of India. It is no irony that the national song and the national anthem of India are written in Sanskrit.

Hindi has different kind of political and social relevance in India. After the baton of pro-independence leadership changed hand from collective leadership of Congress to Mahatma Gandhi, Hindi became a political weapon which Gandhi prudently used to spearhead the movement among the rural masses of India, and Hindi found its new anti English status among the people of Indian villages. Even Subhash Chandra Bose, more secular than Gandhi and ardent believer of armed struggle took resort to Hindi poems and songs,

especially composed to suit his views, to garner support of the Indian youth to build-up his own army to fight the powerful British army. In contemporary Indian politics Hindi is used by all the major political parties to boast patriotism and paint pro-people images for themselves before elections.

Sanskrit has lost practical importance with passage of time, and according to 2010 census only about 50000 people in India use Sanskrit as their day-to-day living language. On the contrary, Hindi is spoken, according to the same census, by roughly 250 million people in India and another 8 – 10 million people in Pakistan. The reasons of such reverse directional movement are multiple. Firstly Sanskrit has from its inception been the language of the elite and the mass was barred using the language and enjoying its beauty. Secondly, Sanskrit is one of the few languages with very complex grammar and pronunciation system. There are quite a good number of words in Sanskrit vocabulary each consisting of 25 to 30 vowels and consonants forming combination between them. The language is highly identified with worshipping God (Paramatma) adhering Hindu religious strictures. The Slokas (Hindu hymns) are very difficult and need to be practiced to be correctly pronounced creating desired spiritual and psychological effects. Even dramas like Shakuntala based on Kalidas's Abhigyan Shakuntalam, one of the gems of world's priced novels based on romanticism and erotica ran in Indian theatre halls with the chairs as only spectator-audiences. Thirdly, with growth of more and more distorted versions of Sanskrit and Pali and influence of regional dialects especially in the eastern, north-eastern and southern part of India, the language lost any literary significance in today's social life of the people.

On the other hand, Hindi is comparatively much easier language than Sanskrit to speak, write and read. Politically it has much more mass appeal than Sanskrit has. For a long time in the history of democratic India political power at the central governance level is concentrated among the political parties originated and nourished in the Hindi-speaking belt of India. This has always added weight to the language. Bollywood, one of the richest so called film and music industry of the world, entirely depends on Hindi language for its survival and growth.

Conclusion

Sanskrit and Hindi are two languages spoken in India. These two languages show more differences between them when it comes to their grammar and characteristics.

Sanskrit is regarded as the parent language or the mother language. It is considered mother of several other Indian languages such as Hindi, Bengali, Marathi, Oriya, Assamese and Gujarati to mention a few. In fact it is true that Sanskrit has its influence on the Dravidian languages such as Telugu, Tamil, Malayalam and Kannada.

Hindi on the other hand is said to have been influenced by Sanskrit. It is developed from the other old languages like Khariboli. Hindi is one of the largest spoken languages of the world whereas Sanskrit ceased to be a spoken language.

It is important to note that both Sanskrit and Hindi belong to the Aryan group of languages. Hindi is characterized by the presence of only two genders namely the masculine gender and the feminine gender. On the other hand Sanskrit is characterized by the presence of three genders namely, masculine, feminine and neuter.

There are only two numbers in Hindi, namely, singular and plural. On the contrary Sanskrit boasts three numbers namely, singular, dual and plural. It is important to know that both Sanskrit and Hindi use the Devanagari script of writing. Sanskrit is one of the oldest languages of the world whereas Hindi is not very old when it comes to its use in the literary forms.

Sanskrit boasts the use of cerebral sounds prior to any other language of the world. It is believed that even Hindi borrowed cerebrals from Sanskrit. Sanskrit is the language declared perfectly fit to be used for the computer. On the other hand Hindi was not considered so. This is due to the fact that Sanskrit grammar is impeccable in the aspects of phonetics and phonology.

Sanskrit has a mythological back-ground and is believed to have been developed long before other classical languages of the world came in. On the other hand Hindi is much younger than Sanskrit and came to be recognized only in the 18th century.

Sanskrit has more complex grammar and composition structure in

comparison to Hindi.

Sanskrit has much greater presence in the field of science and arts than Hindi has.

Sanskrit had tremendous political and social significance in the past. In today's scenario Hindi carries much more political and social weight than Sanskrit does.

Sanskrit speakers have dwindled in number, while the reverse has happened for Hindi.

References:

1 History of Sanskrit Literature by Baldev Upadhyaya.
2 History of Sanskrit Literature By Prof. Jagarnath Pathak.
3 Hindi Sahitya, Yuga and Pravitryan by Dr. Shiv Kumar Sharma.
4 Hindi Bhasha Sahitya aur Nagri Lipi by Dr. Kanahiya Singh.
5 Hindi Bhasha aur Nagri Lipi by Bhola Nath Tiwari

☆☆☆

B. Ganga Devi.
Technical Assistant, Dr. YSR State Museum, Telangana

Musical Instruments as Depicted in the Miniature Paintings from the State Museum - A Study

Dr. Y.S.R. State Museum[1] located in the Public Gardens, Hyderabad, is one of the richest repositories of antiquities and art objects in the country. The present Museum building reflects the Indo-Islamic architecture with subtle domes, high arches, stylistic windows and projected eves. It was originally constructed in 1920s to house a rich collection of dolls of the Nizam's daughter. Mir Osman Ali Khan, the VII Nizam first conceived the idea of a new Museum to be developed exclusively to display art objects and converted this building in to a Museum complex. In 1930, he contributed his personal collection of art objects along with the antiquities recovered from the Nizam's dominion for display on the advice of Dr. Ghulam Yazdani, the then Director of Archaeology Department and it was named as Hyderabad Museum, subsequently renamed as the State Museum under the Department of Archaeology and Museums.

The State Museum[2] of Hyderabad covers almost every aspect of cultural achievement from pre-historic times to present day. More than twenty sections are devoted to the ancient and medieval period which attracts thousands of visitors every day. The total number of paintings in the State Museum are 2767, in that a rare copies of the ancient paintings of Ajanta, Ellora and a Miniature paintings of Deccani School, Rajasthani, Pahad and Congra schools and some other ragamalas i.e., Raga Ragini Paintings, European paintings, Isphahan and Chugtai paintings are attracting the attention of the visitors every day. A fine collection of contemporary art paintings by local artist and distant have been beautifully exhibited in the Museum even today.

Miniature Paintings:

Miniature Paintings[3] are mainly illustrative and depict Mythology,

love, Poetry and moods of music. There are various schools in a miniature art like Jain miniatures, Mughal miniatures, Rajasthani miniatures (Mewar, Jaipur, Bikaner, Bundi, Kotah and Kishan Bagh), Deccani miniatures and Samsthan miniature paintings.

Mughal Miniature Paintings:

The Mughals were enlightened patrons of art under whom architecture and Painting enjoyed a new flowering, Akbar one of the most enlightened rulers in history encouraged a vital interesting school of painting. He invited hundreds of painters from all over India including Gujarat and Rajputana and entrusted them with the work of illustrating the master pieces of Sanskrit and Persian literatures. The Mahabharata of which Akbar's own copy under the name of "Razm Nama" with 169 pictures is preserved at Jaipur, the "Hamza Nama" a book of romantic tales for which 1375 Painters were executed on cloth, the Ramayana the Akbar Nama (Life of Akbar by Abul Fazl) each of which was illustrated jointly by a number of painters.

Jahangir an enthusiastic lover of painting and generous patron of the arts used to pride himself on his critical powers of appreciation. "I am very fond of pictures" he said, and have such discrimination in judging them that I can tell the name of the artists. They are mostly convicted with episode from his own life. He was passionately fond of animals and birds, of which many masterpieces were, at his command painted by ustad Mansoor. Portraits of noble man and saints and scenes from court were popular.

Rajasthani Miniature Paintings:

The pictorial art of Rajasthan 16-17th century shows the Indian genius in its pure form,and must appeal intimately to those who are attracted by the theme of love and devotion.Rajasthani pictorial art shows all that is best and of universal appeal in the emotion life of the Indian people.In the words of Dr. coomaraswamy "the work of the rajput painters deserves to be given an honourable place amongst the great arts of world."Its central theme is love.Love is conceived as the means and symbol of all union.The lovers represented are always Radha and Krishna.

The themes of Rajasthani miniatures are as varied as the medieval literature of Hindu India, in which the sentiments of love and devotion are

mingled with an exuberant joy of life.

The idea of associating music with painting is unique to Indian art.The Raga Ragini(Garlands of Ragas) paintings which had their origin during the 15-16th centuries received the inspiration from the rich Sanskrit and hindi literature,which is filled with poetic beauty,literary fervour,folk songs, devotional hymns and religious poetry.The names of the ragas are linked to their geographical distribution.The different Ragas were appropriated to different seasons,connecting certain strains with certain ideas.

Kangra school of paintings:

Kangra School which flourished in the late 18th&early 19th centuries.The even present theme of Himalaya art is Krishna at his boyhood pranks and his amours with Radha.Dance and music in sylvan surroundings is a recurrent motif of this school.The paintings of Basholi shows unusual brilliance of colour and animated expression. Rhythm, spacious composition and brilliant colour harmonies entitle them to a very high place amongst the pahari master pieces. The paintings of kangra exhibit the fine workmanship of Mughal miniatures.Their tones are subdued and the lines are fine and melodious,especially in the flaming beauty of female figures illustrating the delicate graces of Indian womanhood.

Deccani Miniature paintings:

As an off shoot of the Mughal School and with the encouragement of the local rulers of the Deccan States of Golconda and Bijapur, the art of Deccani Painting developed its provincial idiom in the 17th Century. The subjects how great catholicity, the painters experimenting with portraits, book - Illustrations, Ragamalas and court and Seraglio scenes. Large - scale paintings on canvas was also attempted with success. The style and themes in Deccani Miniature are an amalgamation of various art elements and influences especially the elements of early indigenious art traditions of the Deccan.

TANPURA (PL-II, V, IX, X, XI, XIII)

The tanpura or tambura is a long-necked plucked string instrument found in various forms in Indian music. The name tanapura is derived from tana, referring to a musical phrase, and pura, which means full or complete. It has many different names according to region also known as tambura in south

India. Hindustani musicians favour the term tanpura whereas Carnatic musicians say 'tambura'; 'tanpuri' is a smaller variant used for accompanying instrumental soloists. It is designed in three different styles: Miraj, Tanjore, and Tamburi. In Miraj and Tanjore styles the tanpura is 3 - 5 feet long, but in the tamburi style it is 2 - 3 feet long.

Tanpura form the root of the ensemble and indeed of the music itself, as the tanpura creates an acoustic dynamic reference chord from which the ragas (melodic modes) derive their distinctive character, color and flavor. Concerning its history, A.D, Ranade States: "The first unambiguous reference to the tanpura is in Sangit Parijat (1620). It is neither mentioned by the earlier texts nor does it find a place in sculptures". Stephen Slawek notes that by the end of the 16th century, the tanpura had "fully developed in its modern form", and was seen in the miniature paintings of the mughals.

The body shape of the tanpura somewhat resembles that of the sitar, but it has no frets as the strings are always plucked at their full lengths. One or more tanpuras may be used to accompany vocalists or instrumentalists. It has four or five (rarely six) metal strings, which are plucked one after another in a regular pattern to create a harmonic resonance on the basic notes of a key. Deccan miniature Painting - A King with a Musician sitting before him. Musician is holding a Tambura in his right hand and he is in a sitting posture. King holding a bird in his right hand and holding a Khattar in his left hand and King was listening to music (ACC.NO. P1785)

Deccan Miniature painting, a lady seated before a lady musician. The musician playing sitar another lady is listening to the Music. The painter name is Kareem Baksh (ACC.NO. P3625)

Deccan Miniature Painting, Rama and Sita are seated on the throne and listening to the Music. The Musicians are holding Pakhawaj, Sitar and another Musical instrument. Hanuman is massaging the feet of Rama, a garden is shown in fire ground and a very big Royal Palace. (ACC.NO. P3671)

Jaipur School of Painting, Radha and Krishna with Gopikas and Musicians. The Musicians are playing Tanpura and Pakhawaj, another attendants are holding a objects. (ACC.NO. P5646)

Rajasthani Miniature Painting. A saint with an attendant and listening to the Music. The Musicians are playing Dhol and Tanpura. It is Devangandhari Ragini. (ACC.NO. P5649). A ladies party by Ustad Hamid, Rukunuddin, Bikaner (PLATE.NO.III)

SITAR (PL- I, II, VI, VII, VIII, XII)

The sitar is a plucked string instrument used mainly in Hindustani music and Indian classical music. The instrument is believed to have been derived from the veena, an ancient Indian instrument, which was modified by a Mughal court musician to conform with the tastes of his Mughal patrons and named after a Persian instrument called the setar (meaning three strings). In appearance, the sitar is similar to the tanpura, except that it has frets. The Hindi and Urdu word sitar originally derives from Persian Setar, literally meaning three strings. Another etymology is that it may be derived from sanskrit words saptatantri veena (seven stringed veena), which later was called as sattar (seven strings) and then eventually became sitar. The instrument is thought to have been a version of the Veena, another prominent instrument in Carnatic and Hindustani music, altered in order to conform with Mughal tastes. The sitar flourished in the 16th and 17th centuries and arrived at its present form in 18th century India, gaining prominence in the royal court of the Mughal Empire based in Northern India.

A sitar can have 18, 19, 20, or 21 strings. Six or seven of these are played strings which run over curved, raised frets, and the remainders are sympathetic strings . The frets are movable, allowing fine tuning. The played strings run to tuning pegs on or near the head of the instrument, while the sympathetic strings, which are a variety of different lengths, pass through small holes in the fretboard to engage with the smaller tuning pegs that run down the instrument's neck. Materials used in construction include teak wood or tun wood, which is a variation of mahogany, for the neck and faceplate (tabli), and gourds for the resonating chambers. The instrument's bridges are made of deer horn, ebony, or very occasionally from camel bone. Synthetic material is now common as well. It is balanced between the player's left foot and right knee. The surbahar is a larger sitar with a broader fret-board and thicker strings.

Indian painting - Raga Ragini painting. A Ragini holding a Tambura in his left hand a peacock was shown as attracted by her music and the background scene was indicated to the Vasantha Ruthu (ACC.NO. P2209)

Rajasthani Miniature Painting. Radha & Krishna with Gopikas and Musicians. Both are listening to the Music with a very interestingly sitting on a throne. The Musicians are Holding Pakhawaj and Tanpura. The background scene is indicating the Kartika Masa. (ACC. NO. P6342/B)

Rajasthani Miniature Painting. The King & Queen are sitting on a throne and listening to the Music. The Musicians are playing sitar and Dhol (ACC.NO. P6821).

Kangra School of Miniature painting. Portrait of a lady musician with a Tampura and deer's are shown as attracted by her music the background scene was snow field with green trees. (ACC.NO.P3669).

Mughal miniature painting- prince Dara shikoh and Rana dil. (PLATE.NO. I).

Krishna gathering lotuses in a lake, kishangarh (PALTE.NO. II).

DHOL (PL-II, III, V, XI)

Dhol can refer to any one of a number of similar types of double-headed drum widely used, with regional variations, throughout the Indian subcontinent. Its range of distribution India, Bangladesh and Pakistan primarily includes northern areas such as the Punjab, Haryana, Delhi, Kashmir, Sindh, Assam valley, Gujarat, eastern Maharashtra, Konkan Afghanistan and Goa, Karnataka, Rajasthan and Uttar Pradesh. The dhol is a drum that dates back to the 15th century. It was probably introduced to the Indian subcontinent via the Persian drum type dohol. Evidence for this is found in Ain-i-Akbari, which describes the use of duhul in the orchestra of the Mughal emperor Akbar the Great. The Indo-Aryan word dhol appears in print around 1800 in the treatise Sangitasara.

The dhol is a double-sided barrel drum played mostly as an accompanying instrument in regional music forms. dhols can be found in varying shapes and sizes and made with different woods and materials (fiberglass, steel, plastic). The drum consists of a wooden barrel with animal hide or synthetic skin stretched over its open ends, covering them completely. These skins can be stretched or loosened with a tightening mechanism made

up of either interwoven ropes, or nuts and bolts. Tightening or loosening the skins subtly alters the pitch of the drum sound. The stretched skin on one of the ends is thicker and produces a deep, low frequency (higher bass) sound and the other thinner one produces a higher frequency sound. Dhols with synthetic, or plastic, treble skins are common.

The dhol is played using one or two wooden sticks, usually made out of bamboo and cane wood. The stick used to play the bass side of the instrument, known as the dagga in Punjabi, and is bent in a quarter-circular arc on the end that strikes the instrument. The other stick, known as tihli, is much thinner and flexible and used to play the higher note end of the instrument. A related instrument is the dholak or dholki. It is a double sided barrel drum. The drum is slung over the neck of the player with a strap usually made up of ropes or woven cloth.

Krishna gathering lotuses in a lake, kishangarh (PLATE. NO. II).

A ladies party by Ustad Hamid, Rukunuddin, Bikaner (PLATE.NO. III).

Rajasthani Miniature Painting. A saint with an attendant and listening to the Music. The Musicians are playing Dhol and Tanpura. It is Devangandhari Ragini (ACC.NO. P5649).

Deccan Miniature Painting, Rama and Sita are seated on the throne and listening to the Music. The Musicians are holding Pakhawaj, Sitar and another Musical instrument. Hanuman is massaging the feet of Rama, a garden is shown in fire ground and a very big Royal Palace. (ACC.NO. P3671).

PAKHAWAJ (PL-VI, VII, XIII)

The pakhawaja or mridang is an Indian barrel-shaped, two-headed drum, a variant and descendant of the older mridang. It is the standard percussion instrument in the dhrupad style and is widely used as an accompaniment for various forms of music and dance performances. The pakhavaja has a low, mellow tone, very rich in harmonics. Set horizontally on a cushion in front of the drummer's crossed leg, the larger bass-skin is played with the left hand, the treble skin by the right hand. The north Indian version of the Mridangam, one side of the drum larger than the other.

The word Pakhawaj is of Prakrit origin, whose Sanskrit equivalent is paksavadya. This word is derived from the words paksa (a side), and vadya (a

musical instrument), it is said that, during the 14th century, the great mridangists experimented with the materials used in mridang construction, and finally started using wood for the main body as opposed to the original clay. Thus, a new name pakhawaj emerged, whilst the older name, mridang was still used.

Rajasthani Miniature Painting. Radha & Krishna with Gopikas and Musicians. Both are listening to the Music with a very interestingly sitting on a throne. The Musicians are Holding Pakhawaj and Tanpura. The background scene are indicating the Ashada Masa.(ACC.NO. P63425/A).

Rajasthani Miniature Painting. Radha & Krishna with Gopikas and Musicians. Both are listening to the Music with a very interestingly sitting on a throne. The Musicians are Holding Pakhawaj and Tanpura. The background scene is indicating the Kartika Masa. (ACC. NO. P 6342/B).

Jaipur School of Painting. Radha and Krishna with Gopikas and Musicians. The Musicians are playing Tanpura and Pakhawaj, another attendants are holding a objects. (ACC.NO. P5646).

End Notes:

1. P. Jogi Naidu - A.P. State Museum, Hyderabad, in the year 2000. Pg. No. 1

2. Ibid Pg.18

3. Vasudeva S. Agrawala, (V.S. Agrawala)The Heritage of Indian Art in march 1964, Pg. 32.

4. Ibid Pg.33 5. Ibid Pg.34

6. Ibid Pg.35 7. Ibid Pg.36

8. Mohinder Singh Randawa & John Kenneth Galbraith - Indian Painting - The scenes, Themes and Legends, pg. 51.

9. Ibid Pg.99 10. Ibid Pg.109.